

پیرزادہ قاسم

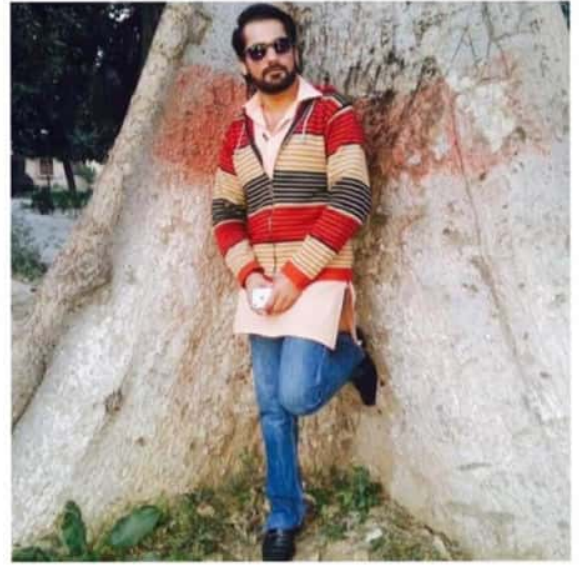
تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے پی
ڈمی ایف کی جاتی ہیں -
مصنف کے خیالات سے ہمارا متفق ہونا

ضروری نہیں -
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے

ایڈمن - سید حسین احسن

0344-818-3736

0314-595-1212



شاعری کی دُنیا میں زمین سخت اور آسماں دُور ہے۔ آئے دن شہر میں بنتی اور مسمار ہوتی ہیں۔ ادب کی دُنیا میں اپنی پہچان قائم کرنا اور اپنی آواز کا جادو جگانا آسان کام نہیں ہے۔ بزرگوں نے لطفِ سخن اور قبولِ عام کو خدا داد کہا ہے اور مشرقی روایت میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ :-

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تاہم تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانا اور اس پر چلا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جب آج سے سات برس پہلے کراچی کی ایک محفل میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کو سنا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ منصبی اعتبار سے وہ سائنس داں ہیں لیکن جذبات کی پرتوں سے جس باریک بینی سے سطحِ شعر پر وہ معائنہ کرتے ہیں اور اپنے خاص دھیمے ملائم اور نرم لہجے میں پُرسوز انداز سے تازہ معنویت کا جادو جگاتے ہیں، وہ خاص ان کی اپنی چیز ہے۔ ان کا دامن روایت سے جڑا ہوا ہے اور جدید عہد کے تقاضوں سے بھی وہ متاثر ہیں۔ ان کی غزل میں نئے عہد کا آہنگ ملتا ہے۔ میں جب ان کا کلام سُننا یا پڑھتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ ایسے شاعر اُردو میں ابھرتے رہیں تاکہ ان کے ہاتھوں اُردو شاعری کا مستقبل تابناک رہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

طباعت سرورق : گولڈن گرافکس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تندہوا کے حشّن میں

پیرزادہ قاسم

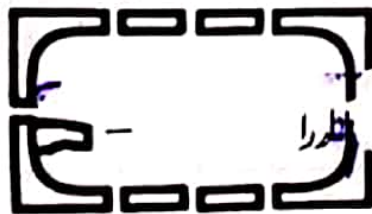
مصنف : پیرزادہ قاسم رضا صدیقی
 ولدیت : حضرت ضیاء صدیقی (قادری، ابوالعلائی، جہانگیری)
 مولد : دہلی
 پیدائش : ۸ فروری ۱۹۴۳ء
 تعلیم : بی۔ ایس سی (آنرز) ایمرالسبی، پی ایچ ڈی (برطانیہ)
 ملازمت : کراچی یونیورسٹی
 منصب : پروفیسر، شعبہ فعلیات
 سکونت : ۱۵۔ اے بلاک ایچ، شمالی ناظم آباد کراچی — پاکستان — فون ۶۱۱۸۰۷
 سیاحت : امریکہ، کیناڈا، برطانیہ، فرانس، کینیا، پیپلک آف ساؤتھ افریقہ، بوٹسوانا،
 بیٹسوانا، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین، سلطنت عمان، بنگلہ دیش، بھارت

جملہ حقوق بحق راشدہ قاسم محفوظ

تصنیف : سندھو کے جشن میں
 سرورق : اقبال مہدی
 کتابت : اسحاق شاہ
 طابع : سندھ آفسٹ پریس، کراچی
 اہتمام طباعت : شیخ امجد علی و شیخ ارشد علی
 اشاعتِ اول : جنوری ۱۹۹۰ء
 تعداد : دو ہزار
 ناشر : راشدہ قاسم، ۱۵۔ اے بلاک ایچ، شمالی ناظم آباد
 کراچی — پاکستان

۱۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنز، گدول لاکھ راج روڈ، اردو بازار، کراچی، پاکستان
 ۲۔ بک شاپ، کراچی یونیورسٹی، کراچی — پاکستان

کتاب
 ملنے
 کا پتہ



اپنے بچوں
شادماں، دانش اور دائم
کے نام ہو
”تندہوا کے حشن میں“
میرے روشن چراغ ہیں

نہ لائی شوخی اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے
غالب

اوراقِ نما

۹	عزیز حامد مدنی	تقریظ
۲۳	سید ابوالخیر کشفی	گواہی
۳۹	سحر انصاری	راکھ کا لہجہ
۴۵	پیر زادہ قاسم	بالمشافہ
۵۳		حمد
۵۵		نعت
۵۷		خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
۵۹		ایک سے سلسلے ہیں سب ہجر کی رُت بتا گئی
۶۱		ہم سے نہ پوچھ، جائے گی ہجر کی رگِ زکریا کہاں
۶۳		یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سرِ شام
۶۵		ہے جبرِ وقت کا قصہ عجب سنائے کون
۶۷		سانحہ نہیں ملتا، سانحے پہ رونے سے
۶۹		کوئی ہے جو شکستِ ضبطِ غم ہونے نہیں دیتا
۷۱		میانِ کار فنِ لفظوں کی قسمت جاگ اٹھتی ہے
۷۳		کہ درتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
۷۵		نظر میں نت نئی حیرانیاں لیے پھرے
۷۷		وہ فرصتیں گئے دنوں کی یاد کیا دلائیے
۷۹		کیسا احوال کہ جب رویا نہ گایا جائے
۸۱		زمانہ میری شکستِ دل کا سوال ہی کیوں اٹھا رہا ہے
۸۳		سفرِ نصیب ہیں ہم کو سفر میں رہنے دو
۸۴		میانِ کار دُنیا ہم سے دلِ ناشاد کیا کرتے
۸۵		اے نفسِ نفسی کی دُنیا اچھا لگا
۸۷		نغمہ نے سے خروش بیکراں پیوند ہو
۸۹		درِ دہے کہ نغمہ ہے فیصلہ کیا جائے
۹۱		میرے کام بہت آتا ہے اک انجانا غم
۹۳		آواز میں آواز ملاتے ہی رہے ہم
۹۵		چاند بھی بجھا ڈال دِل دکھانے والوں نے
۹۷		کارِ خلوص یار کا مجھ کو یقین آ گیا۔

- کسی نے اک حرفِ زلیست پیہم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے ۹۸
عجب ہیں ہم یہ کس کی سعی لا حاصل پہ روتے ہیں ۹۹
مرا جہاں ابھی میرا جہاں بنا ہی نہیں ۱۰۱
اسیرِ جراتِ پرواز آزمانے لگے ۱۰۳
حجرۂ ذات سے باہر تو نکل کر دیکھو ۱۰۵
شکستِ دل میں بھی اک زندگی نظر آئی ۱۰۷
اب کام نہیں کوئی جز کارِ عزاداری ۱۰۹
کبھی ہوا تو کبھی خاکِ رہنمائی رہونا ۱۱۱
گھر کی جب یاد صد اے تو پلٹ کر آجائیں ۱۱۳
قرارِ غم زدگان کیا یہی کہ رو لینا ۱۱۴
دیر سے تیز رو تو ہم خاک و ہوا کے ساتھ ہیں ۱۱۵
گاؤں اب کے بچ نکلا ہے حیرت ہے ۱۱۷
اک سزا اور اسیروں کو سنا دی جائے ۱۱۹
ملے ہی گئے خضر سے رہبر متواتر ۱۲۱
اس خموشی کی زباں کچھ اور ہے ۱۲۳
یہ زرد چاند روحِ کافتر کیسے ہو گیا ۱۲۵
یہ جو دل بہ دل اب تک یارِ یار بہت سی ہیں ۱۲۷
زخمِ دبے تو اک نیا تیر چلا دیا کرو ۱۲۹
بے زمین پودے بھی لہلہاتے ہیں کیا کیا ۱۳۱
دل تجھے راس آئیں گی حسرتیں سب سمیٹ لے ۱۳۲
میرا کشکول انا خیر سے خالی نہ ہوا ۱۳۳
خواب ہی کہیے کہ تھا صحنِ گلستاں کے قریب ۱۳۵
ہو گئے کیا وہ غزلِ خواں خاموش ۱۳۷
بے سرو پا بات سے بات نکالی گئی ۱۳۹
بے ارادہ زندگی بھر رقص فرماتے رہے ۱۴۱
کرب نہاں کو کچھ ہی حرفِ سخن بنا سکے ۱۴۳
دشنام سنا جائے ہر جبر سہا جائے ۱۴۴
پس غبارِ جو اک آشنا سا چہرا ہے ۱۴۵
سرِ کہسارِ غم، اک خطبہٴ تلقینِ غم ہوگا ۱۴۷
زخمِ دل کی روشنی ہے زخمِ کھانا چاہیے ۱۴۹
میں سمجھا مری گھٹن مٹانے آیا تھا ۱۵۱
طلوعِ ذات سے لے کر غروبِ ہستی تک ۱۵۲
عمرِ بتانا چاہو اگر تم خوش افکاری میں ۱۵۳

- ۱۵۴ اسی شہر طرب کے درمیاں تعمیر کرنا ہے
 ۱۵۵ بہ پاس خاطر سرکار کیا نہیں کرتے
 ۱۵۷ شوق کو کب رختِ سفر چاہیے
 ۱۵۹ خود ہی روٹھے ہو تو پھر اس کا مدا کیوں ہو
 ۱۶۱ ہے بہت خواہشِ آزادیِ گفتار ہمیں
 ۱۶۲ کیوں باک مجھے صدق کے اظہار میں آوے
 ۱۶۳ اب خواہ کھلے کہ ابر بر سے
 ۱۶۵ زندگی کے دامن میں رنگ و نور و نکہت کیا
 ۱۶۷ کیوں تجھے اشکِ بدایاں دیکھا
 ۱۶۹ لذت شناسِ درد کہاں ہو سکا ابھی
 ۱۷۱ مدعا یوں میری وحشت کا نہ عنقا ہوتا
 ۱۷۳ کب ترے اقتنا ب نے دل کا زیاں کیا نہیں
 ۱۷۴ گھریا تو آئے گا مگر ٹھیک رہے گا
 ۱۷۵ نہ پوچھیے کہ کہا کیا ہے ان کہی کیا ہے
 ۱۷۷ اک خنک موجِ صبا کے مانند
 ۱۷۹ نئے غم جب کسی عنوان ملے ہیں
 ۱۸۱ کب ہوا آئینہ حیراں مقابل کے سوا
 ۱۸۳ وفا شناس نہ وہ دل لگانے والا ہے
 ۱۸۴ دورِ ہوس میں دوستو دل کی تو ہے مثال سنگ
 ۱۸۵ اُسی کی طرح سے اس کا بھی جی جلائیں کیا
 ۱۸۶ جو قربتوں میں محبت سا ایک رشتہ تھا
 ۱۸۷ اگرچہ محفلِ اغیار ہی میں شامل تھا
 ۱۸۹ کوئی ممنون کرے مجھ کو یہ عقدہ کھولے
 ۱۹۱ رُوحِ گروہ کناں ہو تو غزل ہوتی ہے
 ۱۹۳ میری غزلوں کی جاں ہو گئے
 ۱۹۵ موسمِ مرے دل کے
 ۱۹۷ یاد رکھنے کا ہنر
 ۱۹۹ ایک مفرد مکالمہ
 ۲۰۱ ملاقات
 ۲۰۳ سچا مال
 ۲۰۵ بے بسی
 ۲۰۸ انتظار
 ۲۰۹ بے سخنی

۲۱۳	عشق کہانی
۲۱۵	یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
۲۱۷	تماشا گاہ ہستی میں
۲۱۹	ہمیشہ قتل ہو جاتا ہوں میں
۲۲۱	کل جو آنے والا ہے
۲۲۳	سفاری پارک
۲۲۵	اعلان
۲۲۷	سرزمینِ دل
۲۲۸	انسان
۲۲۹	بے آس
۲۲۹	بے ساختہ
۲۳۰	آرزو کی انتہا
۲۳۱	دعا
۲۳۳	میں اور میرا عشق
۲۳۴	تشویش
۲۳۵	شمارِ معکوس
۲۳۶	خواہش
۲۳۷	ہارجیت
۲۳۸	محبت
۲۳۹	رقاصہ
۲۴۰	جواز
۲۴۱	بیراگ
۲۴۱	انصاف
۲۴۲	تسلل
۲۴۲	احساسِ ندامت
۲۴۳	اُس کی خاطر
۲۴۳	پسپائی
۲۴۴	خیر مقدم
۲۴۴	میری خاطر
۲۴۵	تخلیقِ مسلسل
۲۴۶	استغاثہ - بخنور سرور کوئٹہ

تقریظ

عہدِ حاضر میں بھی شاعری کے بنیادی اجزاء تغزل اور علامت ہیں۔ ایک کا تعلق شاعر کے مزاج میں کسی تاثر اور تجربہ سے پیدا ہونے والی کیفیت سے، اسلوب کی نفاست اور آہنگ سے ہوتا ہے اور دوسری کا تمام پیچیدگیوں اور الجھنوں سے دور کسی نہ دار بات کی اشارت کو سامنے لانے سے ہوتا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ شاعر کا کلام اپنی تہذیب و تاریخ کی آگہی رکھتا ہے تو یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو از خود اس کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے۔ یہ شاعری کی ترکیبی ساخت میں لازمی ہے۔ شاعری کے معتبر ترین نقادوں نے مغربِ مشرق میں ارسطو اور ابنِ رشیق سے آج تک شاعری کی ترکیبی ساخت اور اس کی پرکھ کے اصولوں کی جو ناقابلِ مسترد تختی لکھی ہے وہی ہم سب کے سامنے ہے۔ اس میں کسی اضافے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر ہر شاعر کے کلام کی صفت پرکھی جاتی ہے۔ اس پرکھ کی بھی کئی سمتیں ہوتی ہیں اور ہر نقاد اپنے عہد کے انداز و اطوار کا ایک معیارِ ذہن میں رکھتا ہے۔ معیار کی سطح اور فکر کی جہت کا مرحلہ تنقید میں کلام کے خوب و ناخوب کو عیاں کرتا ہے اور اسے ہر عہد کے بڑے شعرا سے معیاری شعرا تک وسعت دے کر تنقید ان تمام داخلی و خارجی مراحل کو سمجھاتی ہے جس سے شاعر گزرا ہے۔ وہ تیسرا عہد ہو، غالب کا عہد ہو، اقبال کا عہد ہو، حسرت، جوش و فراق کا عہد یا فیض، مجاز اور راشد کا دور ہو یا ۵۰ء کی دہائی کے شعرا کا دور ہو یہ سب ادوار اپنے مخصوص عوامل کے ساتھ آتے رہے ہیں۔ رجحانات کے نئے زاویے پیدا ہونے میں اور نئے شعرا کی تعلیم، تربیت و تجربے اور تخلیقی صلاحیت کے بروئے کار آنے میں کم از کم بیس سال کا وقفہ ہوتا ہے اس لیے رجحانات کے بدلنے کی یہ تقسیم ہر زبان میں اسی طرح کی گئی ہے اور یہ سلسلہ گویائی کے چشمہ جاری کی طرح اب ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا تک پہنچا ہے۔ ہمارا عصر جو عہدِ فرنگ کے دورِ حکومت سے شروع ہوا علوم کے بے شمار شعبوں، ماہرین کی آرا، معاشرے کی سیاسی و سماجی تنظیم اور سماجی نشیب و فراز کا دور ہے اور ایک معاشرے کے فرد کی حیثیت سے شاعر انہیں چیزوں میں گھرا ہوا ہے۔ انہی چیزوں کے تصادم و اتفاق سے پیدا کردہ مثبت و منفی اثرات سے پیدا ہونے والی ایک کیفیت کلام میں پیدا ہوتی ہے جسے ہم تغزل کہتے ہیں۔ اس تغزل والی کیفیت (LYRICISM) کو وسیع تر معنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بہر کیف اس مزاج کی شاعری کا رنگ ایک علامتی پیرایے میں غزل میں زیادہ نمایاں ہوا تو ہم نے اس کو ایک آہنگ اثر کیفیت (LYRICISM) کا ثبات دیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی قالب میں اقبال کی

سیاسی اور تاریخی شعور کی نظم کا شعر ہے :

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بلائے بام آیا تو کیا

جدید تر دور کی گفتگو ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا تک آئی تھی اور اس کا سیاق و سباق بھی عصر نو اور بیسویں صدی کا تھا۔ ہمارا عہد اپنی تیز روی کی رو میں ہمیں کہیں ٹہرنے نہیں دیتا۔ مشرق میں اس کے خرام کی رفتار کم سہی مگر ایسے تغیرات میں زندگی کے منتشر اجزاء جدید فکر پر اثر انداز ہوتے ہوئے خیال کا ایک دائرہ سامنے آ رہے ہیں اور اسی میں ایک (AVANT-GAURDE) کی سی کیفیت موجزن رہتی ہے۔ اسی میں روایت کی ایک زنجیر بھی جڑ جاتی ہے اور پھر خود ہی الگ ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال خوش آہنگ غزل میں بھی مل سکتی ہے۔ اور نثری نظم کے ٹکڑوں میں بھی۔ میں نے یہ خصوصیت ۱۹۷۰ء کی دہائی کے پاکستان، ہندوستان اور بیرون جات کے ذہین و معیاری شعرا میں یکساں پائی ہے۔ آج کی دنیا اپنی جغرافیائی حدود میں اپنے مسائل الگ الگ رکھتی ہے مگر مواصلات اور نشر و اشاعت کی سہولت کی وجہ سے ایک عالمی تصور بھی ساری انسانی وحدت کا موجود ہے یہ سارے رجحانات شعر و ادب میں ایک نہ ایک رنگ میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں بھی انہیں میلانات کی پرچھائیاں ہیں۔ مغرب کی فکر اور مغربی شعرا اور ان کے اثرات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے ان کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں ہے۔ یہ اثرات موجود ہیں اور ان سے ہمارے ادب نے ایک نیا رخ پایا ہے جو ہماری روایت سے مل کر حسین تر ہو گیا ہے اور انہیں اثرات کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے ان شعرا کی تخلیق ایک ذاتی نوٹ یا سلسلے پر ختم ہوتی ہے جو کسی ان دیکھے ملاں کا سراغ بھی ہے اور ایک نئی امنگ کی شعلہ بیانی بھی۔ انہیں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں ”تند ہوا کے جشن میں“ کے شاعر پیرزادہ قاسم ہیں جن کے ہم پیشہ پروفیسر صاحبان میں کئی ادیبوں اور شعرا سے میں ذاتی انس رکھتا ہوں۔ ان میں عزیز میڈیکل ڈاکٹر ظفر سعید سیفی بھی ہیں اور پروفیسر سحر انصاری بھی۔ (سیفی جو شعر و ادب کا اچھا شعور رکھتے ہیں انہیں دوسرے شعبوں کی قدروں کو زیادہ کارگر پاکر شعر گوئی سے فاصلہ رکھنے کی رائے میں نے دی تھی) ان دونوں صاحبان کے توسط سے مجھے پیرزادہ قاسم سے بھی شناسائی کا موقع ملا۔ سیفی نے مجھے ان کی ایک ابتدائی غزل کی ٹیپ ریکارڈنگ سنائی۔ اسے کئی سال گزر چکے ہیں۔ غزل تھی :

روح گر نوحہ کناں ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو احساسِ نیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
دھیمے دھیمے سے سلگتے ہوئے جذبات کے ساتھ
میر کا طرزِ بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

الفاظ کی اس رد (روح نوحہ کناں، احساسِ زیاں، دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے جذبات)

میں ابتدائی سراغ اسی ذاتی اور نجی مرحلے کا تھا جو زندگی کا ”لال حاصل“ ہے۔ میں ان کا مرتب کردہ مجموعہ ”تندرہوا کے جشن میں“ دیکھتا ہوں تو ان کی تعلیمی اور درسی پیشہ ورانہ صلاحیت سے الگ اسی لال کے تجربے کی ایک پرائیویٹ ڈائری ملتی ہے۔ ان کے کلام میں وہ ایک ”حلقہ لال“ جو آہنگ کی تلاش میں تھا اپنے درسی ماہرانہ شعبے کی اصطلاحات سے دور خود کی اور اپنے مثال کے لوگوں کی تلاش میں ایک خلوتی کی طرح نمایاں ہوا ہے۔ انہیں اکثر سامعین نے بڑی بڑی جلسہ گاہوں میں PUBLIC PERFORMANCE کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے بھی ایک آدھ بار مشاعرے میں سنا ہے وہاں بھی مجھے ان کی محویت ایک خلوتی کی حیثیت سے ملتی ہے۔ چونکہ ان کا پیشہ ایک معلم کا ہے جس کے سامنے ہمیشہ ایک سامع رہتا ہے تو کوئی وجہ STAGE SHY یا MICROPHONE SHY ہونے کی نہیں ہے مگر ان کا کلام داد و تحسین کے درمیان کبھی اپنے خاص سامع کا انتخاب کرتا رہتا ہے کبھی خود سے بات کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ذات کی تنہائی میں کھوجاتا ہے کبھی اپنی شکست کی لے بن جاتا ہے۔ اس میں کئی رنگ کئی زاویے، کئی گردشیں ایک ہی غزل کی چکری میں لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ ساری متضاد کیفیات، وہ سارے معاشرتی منتشر اجزا جو زندگی کا خاصہ ہو گئے ہیں۔ ان کے کلام میں جھلک اٹھتے ہیں:

ہماری ذات میں محشر بیبا ہے مدت سے
مگر یہ ہم کہ کوئی فیصلہ نہیں کرتے

یاس کا اندھیرا بھی آس کا احبالا بھی
لوگ اسی کو کہتے ہیں جھٹپٹے کی ساعت کیا

یہ ناگہاں جو ہوئی سہم کر فضا خاموش
کچھ ایسا لگتا ہے، طوفان آنے والا ہے

اندازہ ہوا کے پیچ و خم کا
ہوتا ہے شکستہ بال و پر سے

ان متضاد کیفیات کے ساتھ میں نے یہ کہا ہے کہ ان کے کلام میں ذاتی اور نجی تجربات کی ایک ڈائری ملتی ہے جو پھر ”لال حاصل“ پر ختم ہوتی ہے اس کی مثالیں نثری نظم کے ٹکڑوں میں بھی ہیں:

یہ یاد رکھنے کا سہرا آساں نہیں ہوتا۔
کسی کو یاد رکھنے میں
بہت کچھ بھول جانا بھی تو پڑتا ہے (یاد رکھنے کا سہرا)

تمہاری بند مٹھی میں
یہ کیسی خاک ہے جس میں
میری خوشبو ہے
میرا رنگ ہے
اور لمحہ لمحہ سرد ہوتی زندگی کی
کچھ حرارت ہے
وہی اک دھیمی دھیمی بے سخن سی گفت گو ہے
جلتی بجھتی روشنی ہے
کچھ ادھورے خواب ہیں
خوابوں کی تعبیر ہیں

(ایک مفرد مکالمہ)

ان کا کلام جب عمر کی منزل میں طے کر رہا تھا تو اس میں انہی کیفیات کا اظہار بغیر اپنا آہنگ کھوئے ہوئے دلپذیر تر ہو گیا۔ اس میں جدید فکر کے گوشے بھی نکلتے گئے اور روایت کا پاس بھی بڑھتا گیا جس کے بغیر کسی بھی کلام کا توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ جدید فکر کو سمجھانے میں ہمارے بزرگوں میں سرسید احمد خاں، حالی اور اقبال کے دور سے اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھپوری تک سب ہی آتے ہیں۔ نظریاتی بحثیں بھی ہیں فلسفہ جمالیات بھی ہے، نامیاتی اور تاریخی شعور کے زاویے بھی ہیں، انکشافات کے مراحل بھی ہیں اور ان سارے سلسلوں کے لیے تازہ ترانہ از میں پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر محمد حسن عسکری اور پروفیسر مجتبیٰ حسین کی تحریریں بھی ہیں جن میں مغرب کی فکر کے مختلف ادوار اور تحریکیں بھی موجود ہیں اور ہماری شاعری کے رجحانات کا ایک شعور بھی ہے اس لئے جدید فکر کی تشریح کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ اس کے تجربے اور اظہار کے طریقے شعر و ادب میں مختلف رہے ہیں مگر ایک آہنگ کی تلاش اور علامت کا پیرایہ اس کے بنیادی عناصر ہیں اور کسی بھی زبان کے ادب میں روایت کا ایک تسلسل وہ بھی بدلے ہوئے محاورے کے باوجود ہر دور میں نظر آئے گا۔ روایت جس کی سکت کا نصف حصہ شاعری کے محاورے سے تعلق رکھتا ہے جو بڑے اور معیاری شعرا کے کلام کی رد میں خود شاعر کی تخلیقی صلاحیت اور اس کے دور کے تقاضوں سے منسلک ہے تو اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے عہد جدید کے مختلف ادوار بھی سامنے ہیں اور شعرا کی تخلیقات بھی۔ خود ہمارے عصر میں جدید فکر پر نئے علوم اور اس کی تکنیک کا اثر معاشرے کی تنظیم پر ہوا ہے۔ اس تغیر کو لا شعوری طور پر قبول کرنے میں ایک بدلی ہوئی نفسیات، ایک نئی سماجی ضرورت اور تعلقات کی دُنیا کا ایک نیا رخ نمایاں ہوا۔ یہ رخ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے شعرا میں کچھ اور ہے، ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شعرا میں کچھ اور۔ اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں کچھ اور۔ ان میں آپ کو ایک انحرافی رو بھی ملے گی اور جستجو کی نئی کاوش بھی۔ اس کی مثالیں انگریزی اور اردو شعرا کے ادوار سے دی جاسکتی ہیں کیونکہ ان دونوں زبانوں

کالکھا پڑھا قاری ان سے دلچسپی رکھتا ہے۔ انگریزی میں ۱۹۳۰ء کی دہائی کے شعرا میں آڈن، ہی ٹی لیوس، لوئی میکینس اور اسپنڈر آتے ہیں اور ہمارے یہاں فیض، مجاز، راشد اور ان کے ہم عصر۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے انگریز شعرا میں فلپ لارکن، ڈونیلڈ ڈیوی، ایلزبتھ جینکس وغیرہ جن کے کلام کی خصوصیت آڈن کے دور سے الگ ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۰ء کی دہائی کے ہمارے مختلف مزاج کے شعرا، ساتھ لڈھیالوی، ضیا جالندھری، ناصر کاظمی، سلیم احمد، خلیل الرحمان اعظمی یا مصطفیٰ زیدی بھی فیض کے دور سے الگ ہیں اور جس طرح انگریزی زبان کے امریکی اور انگریز شعرا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں کچھ اور ہیں۔ اسی طرح اردو کے شعرا کا ۱۹۴۰ء کی دہائی کا دور کچھ اور ہے۔ انہی کی تخلیقات کی خصوصیات کا نقاد جائزہ لے رہے ہیں اور انہی خصوصیات کی طرف میں نے پیرزادہ قاسم کے کلام کے توسط سے اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنے ہم نواؤں میں اس دور کے اچھے نمائندہ ہیں۔ ان کے مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی جو کئی پیرائے میں ہیں۔ ان کی غزل میں درد کی ایک لہر شائستگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس میں لب و لہجہ کی تازگی بھی ہے۔ روایت کی پیوستگی بھی ہے اور سیاق و سباق کی بے دیاری نہیں ہے :

ضبط کی سوکھی زمیں کو کھیتوں کی ہے طلب
آہیں بونا چاہئیں، گر یہ اگانا چاہیے
درد کی لئے وقت سے آمیز ہو جائے تو پھر
خوب رونا چاہیے اور خوب گانا چاہیے
بس یونہی کچھ گماں سا تھا کوئی پس سخن بھی ہے
درد جو لب کشا ہوا مجھ کو یقین آگیا
درد ہے کہ نغمہ ہے فیصلہ کیا جائے
یعنی دل کی دھڑکن پہ غور کر لیا جائے
اسی شہر طرب کے درمیاں تعمیر کرنا ہے
مجھے اک گوشہ آہ و فغاں تعمیر کرنا ہے

انہوں نے غزل کی اک لے پالی ہے۔ پس سخن بھی کسی کے ہونے کا گمان ہے۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں مشاہدات، ذاتی تجربوں اور ایک سوچ کے جو مختلف سمتوں میں بٹی ہوئی ہے، کئی خوبصورت ٹکڑے ہیں۔ وہ تیز رفتاری جو معاشرے میں نئے تقاضوں کی وجہ سے کئی تغیرات کا باعث ہے اور تفصیلات میں ایک پھیلاؤ چاہتی ہے۔ ان کے یہاں جانی پہچانی لغت شعری میں ہے اور کبھی کبھی ایسے سماجی تقاضے ایک دباؤ کی طرح زندگی کی مجبوریوں کی اس اساس کو نمایاں کرتے ہیں جو آج موجود ہے :

میں کتنی بار دنیا تاج کے جا بیٹھا ہوں گوشے میں مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے
یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے اگر یونہی جیا کیے ضرورتوں کے درمیان
ملے تھے ہم کہیں کار جہاں کے میلے میں اُسے بھی جلدی تھی اور میں بھی گھر گیا سرِ شام
اور اب تو کار و بارِ عشق بھی نہیں مجھے بے سبب جوابِ منفعت میں ہو تو پھر قدم اٹھائیے
کوئی بھی صورتِ حالات دیر پا نہ ہوئی جو غمِ عزیز ہو جاوداں بنا ہی نہیں
ضرورت، ضرورتوں، کار جہاں کے میلے، جوابِ منفعت میں ہو، صورتِ حالات دیر پا نہ ہوئی،
وہ تلخ حقیقتیں ہیں جو سامنے ہیں۔

یہ سوال اٹھتا رہا ہے کہ یہ جدید فکر جو حالی اور اقبال سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے اور جس میں
نزاعی مسائل پر طویل بحثیں ہیں اور جو نظم اور غزل دونوں کے پرانے اطوار ان کی فکری ساخت اور لغت
شعری کو سمیٹتی ہوئی اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ جدید ذہن وہی ہے جو نئے علوم، اس کے طریقہ کار سے اور
پورے معاشرے کے تغیرات سے پیدا ہوا ہے اور اس جدید ذہن کی تخلیقات اپنے پیرائے اظہار، فکری
ساخت اور لغت شعری میں دوسری ہو گئی ہیں اور ہو جانی چاہیے تھیں۔ اس بات کا ثبوت ۳۰ء کی دہائی
اور ۵۰ء کی دہائی کی تخلیقات سے ہم ہو گیا ہے کہ یہ بلاشبہ مختلف ہیں۔ نظموں کے قالب میں بھی اور
غزل کے رخ میں بھی۔ پچھلے دونوں ادوار میں یہ بات نظموں میں زیادہ نمایاں ہوئی۔ یوں دیکھیے تو وہ نئی
شاعری کی روایت جو حالی سے چلی تھی اقبال نے اسے کلاسیکل انداز میں تکمیل تک پہنچایا۔ ان کی بال جبریل
کی غزل بھی ان کی کلی فکر کا ایک حصہ ہے۔ جوش نے بھی اپنی نظموں میں کلاسیکل پیرایے میں جدید ذہن کا تسلسل
قائم رکھا۔ راشد، فیض، مجاز اور ان کے ہم عصروں کی نظمیں بھی اسی تسلسل کا حصہ ہیں جو بدلتا ہوا آخرِ ایمان
ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری سے مصطفیٰ زیدی تک آیا ہے۔ آج بھی نظم جدید ذہن کی پوری توانائی کا
تقاضا کرتی ہے۔ غزل کا نیا رخ فراق سے شروع ہوا اور اس میں جتنی گنجائش نکل سکتی تھی وہ فیض، مجاز
جذبی جان نثار اور مجروح کے یہاں مل جاتی ہے۔ غزل کا مزاج اور اس کی روایت، اسلوب کی شائستگی
اسی لغت شعری کو قبول کرتی ہے جو قبولیت کی حد تک آچکی ہو۔ ادھر جدید ذہن کی وہ نظمیں جو ۷۰ء کی
دہائی کے شعرا کی تخلیقات میں ملتی ہیں۔ اپنے نئے پن، تنوع، چونکا دینے والی کیفیت میں دلپذیر ہونے کے
باوصف اپنا حصار قائم رکھنے میں کچھ اور توجہ چاہتی ہیں جو نئے رجحانات کا تقاضا بھی ہے۔ غزل کے
ایک بڑے حصے کو اجنبیت کے باوجود استعاروں اور اشارت اور روایت کے پاس نے بچا لیا۔ قصہ یہ ہے
کہ آج شاعری موجودہ معاشرے کے مزاج کا لازمی جزو نہیں ہے۔ اس کی ضرورت نہیں۔ پہلے یہ اس کی

تہذیبی اور فکری ساخت کا لازمی جز تھی۔ اب یہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جمالیات نو کے مختلف شعبوں نے انسانی جذبات کی تسکین کے لیے کچھ اور چیزیں ترتیب دے رکھی ہیں۔ سارا نظام زندگی معاشرے میں ضروریات بہتر ذرائع آمدنی اور ایک محفوظ تر مقام کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔ اس دوڑ میں سب شامل ہیں۔ الفاظ کا کار آمد صرف زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے سامنے ہیں۔ زندگی کے یہ مختلف زاویے جو خیال کا ایک دائرہ پیدا کرتے ہوئے کھو جاتے ہیں اور بار بار اپنی گردش کا ایک طلسم پھر پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کو AVANT GUARDE کی کیفیت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس کا معاشرے سے تعلق ٹوٹا نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی شکستگیء دل لیے ہوئے، ہجوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی آمدنی، پناہ اور سفید پوشی کا ذریعہ معاشرہ ہے۔ وہ بھی اپنی تخلیق میں کسی قدر چونکا دینے والی روئے کر جو مقابلے کی سکت رکھ سکے، نئے تقاضوں کے اندر سما سکے، معاشرے میں شامل ہے جہاں خاندان کی استواری کی، دوستی کی، مرد و زن کے آپس میں اعتبارات کی قدریں اگر بالکل بدل نہیں گئی ہیں تو کچھ اور ہو گئی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر ان قدروں میں نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں بھی شاعر کے تجربات کا حصہ ہیں۔ اس شکست و ریخت کے درمیان ایک نئے مزاج کی زندگی آگئی ہے۔ اس بات کا احساس بھی پیرزادہ کی شاعری کا حصہ ہے۔

کدورتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیاں
زمانہ میری داستاں پہ رو رہا ہے آج کیوں
یہی تو کل سنی گئی تھی قہقہوں کے درمیاں
ابھی شکست کیا کہ رزم آخری اک اور ہے
پکارتی ہے زندگی ہزیمیتوں کے درمیاں
اور اہمی ہزیمیتوں سے ایک اور قرب اور دوری کے درمیاں دیکھیے :
گئے برسوں کی کتنی ساعتوں کو موسموں کو میں
اگر آواز دیتا ہوں
تو بس ایک ناشیذہ سی صدالبیک کہتی ہے
کوئی نادیدہ سی اک روشنی ہے جو نگاہوں میں
فروغِ شعلہ خس کی طرح اٹھتی ہے
پھر معدوم ہوتی ہے
مہکتے موسموں کو یاد کرتا ہوں
تو اک نایافتہ خوشبو سی لہراتی تو ہے لیکن

مشام جاں کو آسودہ نہیں کرتی
بہت کوشش کروں تو ایک پرچھائیں سی آنکھوں میں
اتر آتی تو ہے لیکن
مجسم ہو نہیں پاتی

میں اپنی بے بسی اور بے کسی پر
صرف ماتم ہو چکا کب کا
مگر اک آس باقی ہے
کہ شاید پھر اچانک حادثہ ہو رو نما کوئی
وہی اک حادثہ
جو شرط آغاز محبت ہے
وہی اک حادثہ
جس میں تقاضا ہے بچھڑنے کا

پیرزادہ قاسم اور ان کے توسط سے ۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں جو خصوصیات میری سمجھ میں آتی
ہیں میں نے ان کا تذکرہ کر دیا ہے۔

ابتداء میں ایک بات آئی تھی کہ عصر حاضر میں بھی شاعری کے بنیادی عناصر تغزل اور علامت ہیں۔ تغزل
(LYRICISM) کو سمجھانے کی میں نے کوشش کی تھی۔ تغزل شاعر کی وہ کیفیت ہے جو اس کے جذبات میں آہنگ
پیدا کرتی ہے۔ یہ کیفیت نظموں اور غزلوں میں یکساں آسکتی ہے اور آتی رہی ہے۔ اس میں ایک خود کلامی کی رو
بھی ہوتی ہے اور ایک شعوری رو بھی جو متضاد عناصر کو ایک اکائی میں دیکھ سکے۔ یہ ۳۰ء کی دہائی سے ہر پیرائے
سخن میں آتی رہی ہے۔ نظموں اور غزلوں میں یہ یکساں ہے مگر ہماری شعری روایت پر غزل کا قبضہ ہے۔ غزل
کی روایت، سماعی، فیض سخن اور حافظ کی نفیات کی سہل اور سیدھی ہے۔ زبان پر لغت شعری کا ایک مانوس
حصہ ہے جو نوے فیصد شعرا کے کلام میں جاری اور ساری ہے۔ دس فیصد میں تغزل کا وہ عنصر آتا ہے جس میں
فکر بھی ہے آہنگ بھی اور ان کا معیار بھی الگ ہے جس کی پرکھ کی دلیل ذوقِ سلیم ہے۔ اس نوع کے کئی شعرا
۷۰ء کی دہائی میں بھی ہیں اور انہی میں پیرزادہ قاسم بھی ہیں۔ ان کے یہاں تغزل کا عنصر ہے۔ غزل میں بھی اور
نظم میں بھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا میلان طبع غزل میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزل میں متضاد عناصر بھی
اکائی بناتے ہوئے ملتے ہیں۔ مسلک اور مقام سے دوران کی غزل میں بے ساختگی ہے جس کی ایک لے قائم کر کے
انہوں نے ردیف میں چھپے ہوئے فکری رُخ کو نمایاں کیا ہے :

خون سے جب جلادیا ایک دیا بجھا ہوا
پتھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

ایک ہی داستانِ شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا

مجھ کو نشاط سے فزوں رسمِ وفا عزیز ہے
میرا رفیقِ شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے میری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

سب میری روشنی جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

یہ ان کی پسندیدہ غزل بھی ہے اور ہم سب کی بھی۔ ردیف میں چھپے ہوئے فکر کے رُخ کا ادراک اس دور کے بڑے شعرا مثلاً فراق میں تو تھا ہی جدید تر دور میں مجروح، ناصر کاظمی اور سلیم احمد میں بھی اس کی احتیاط آپ کو مل جائے گی۔ پیرزاد، قاسم اور ان کے ہم نواؤں میں اس کا پاس ہے۔ ان کی غزلوں کی بعض ردیفوں میں یہ رُخ نکھر گیا ہے۔ ردیف تو فعل ہی ہوتی ہے اور ماضی، حال، مستقبل اور ان کی ساری اقسام کا رُخ کر سکتی ہے اس میں فکر کی جہتیں ہوتی ہیں۔ بے ساختگی میں کہے ہوئے اشعار میں ردیف کھل اٹھتی ہے۔ ان کی ایک غزل کی ردیف ہے ”گیا سرِ شام“ اب اسی میں قافیہ کی پیوستگی اور جذبات کا رخ دیکھئے:

یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سرِ شام

جو زخمِ صبح ملا تھا وہ بھر گیا سرِ شام

شبِ فراق کا احوال یاد آ ہی گیا

پھر ایک تیر سادل میں اتر گیا سرِ شام

اسی طرح ایک ردیف ہے ”جاگ اٹھتی ہے“۔ یہاں بھی ردیف نے فکر کو مختلف زاویے دیے ہیں۔

بہت مسرور رہتا ہوں بہت چہرہ سجتا ہوں

مگر آئینے میں اک اور صورت جاگ اٹھتی ہے

عجب دیکھا کر شمعِ لفظ کی بازی گری کا بھی

سخنِ معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

دور دلیفیں اور ہیں۔ ایک دو لفظی ہے، ”اچھا لگا“ اور ایک چھ لفظی ہے، ”ہوا پہ تحریر کر دیا ہے۔“ ان ردیفوں میں خیال کے نئے رُخ کھلے ہیں۔

تیرہ شبی کو بابِ سحر تک پہنچا کر
اب گھر چلیے، دل کا کہنا اچھا لگا
غم کے موسم نے یہ عجب احساس دیا
دردِ دنیا اور زخمِ پرانا اچھا لگا

کسی نے اک حرفِ زلیست پیہم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
سو میں نے بھی اپنا شجرہ غم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

اور آج کی خوف و ہراس کی دنیا کی طرف مڑتے ہوئے ردیف کیسی چپاں ہوئی ہے۔

غبارِ بارود، رقصِ شعلہ، دھماکے میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشورِ امنِ عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
پیرزادہ کی غزلوں اور نظموں میں ایک اندر سے پیدا کردہ مہم، لطفِ انگیز اور رواں آہنگ ملتا
ہے۔ ان کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے جن کے فکری رُخ میں ایک تنقید بھی ہے:

دن بھر میں اور کارِ زمانہ لیکن شامِ ڈھلے
ساتھ مرے گھر آ جاتا ہے اک انجانا غم

اتنی سفاک سماعت بھی غضب ہے کہ جہاں
بات پوری بھی نہ ہو ہاتھوں میں پتھر آ جائیں

پھر وہ ہوا کا قہقہہ کان میں گونجنے لگا
اور بھی اک دیا بجھا مجھ کو یقین آ گیا

ہم نے خستگی پائی، دل گرفتگی پائی
خیر، ہم سے کیا پایا دل دکھانے والوں نے

عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر میں
کسی کا ذہن، کسی کی زبان لیے پھرے

میرا کھولِ انا خیر سے خالی نہ ہوا
میں تہی دست رہا پھر بھی سوالی نہ ہوا

ایک سے سلسلے ہیں سب ہجر کی رُت بتا گئی
پھر وہی صبح آئے گی پھر وہی شام آگئی
میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی
تازہ بریدہ شاخِ گل تجھ کو تو ہوش ہی نہیں
دیکھ ترے قریب سے رقص کناں صبا گئی

اسی طرح شدتِ احساس سے پُر کئی بندگان کی نظموں میں بھی ملتے ہیں جو ان کے تجربے و مشاہدے
ہیں اور زندگی کی تمثیل میں کردار کی طرح ہیں :

تماشا گاہِ ہستی میں عجب اک کھیل جاری ہے
ستارے چاند سورج آسمان اور بحر و برسات
ہوائیں اور خوشبو، نغمہ و آہنگ گہ سارے
اسی اک کھیل میں تاحد امکاں صرف ہوتے ہیں
تماشا گاہِ ہستی میں بلا کی گہا گہمی ہے
تو پھر اس میں تعجب کیا

اگر میں بھی اسی تمثیلِ ہستی میں
کہیں پر خسر چ ہو جاؤں (تماشا گاہِ ہستی میں)

ان کی نظمیں، ”ملاقات“، ”بے سنجی“ اور ”عشق کہانی“ ایک ذاتی تجربہ ہیں جس میں یاسیت کی ایک
آہستہ روی سی شامل ہو جاتی ہے جو یوں بھی ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں کے کچھ بند
اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں۔

خواب خواب آنکھوں میں
روشنی سی لہرائی
درد کی سماعت میں
نغمگی سی در آئی

بے دلی کی ساعت نے
دل کی کچھ خبر پائی

وہ تھی، چاند تھا، میں تھا
یوں تو کتنے چہرے تھے
اپنی ذات کے اندر
ہم سبھی اکیلے تھے
سرد سرد اک چہرہ
زرد زرد اک چہرہ
گرد گرد اک چہرہ

در یافتہ چہرے، ہجر یافتہ چہرے
جیسے رو برو اپنے آئینے سے رکھے تھے
(ملاقات)

میرا لہجہ بے سخی ہے
تم چاہو تو یہ لہجہ یہ بے سخی
تم بھی اپنا
اور پھر اپنی خلوت جاں سے مجھے پکارو
میں تم سے یوں آن ملوں گا،
جیسے ہوا کی سرگوشی پر
زرد ہوئے بے قیمت پتے
کچھ نہیں کہتے
ٹوٹ کے اس سے آلتے ہیں
(بے سخی)

میں بے قیمت تم بے قیمت
پھر

یہ اپنی عشق کہانی کون سنے گا
(عشق کہانی)
پیرزادہ قاسم ۱۹۷۰ء کی دہائی کے جدید تر شعرا کی صف میں ہیں۔ اس عہد کے نئے تقاضے اور

وہ سارے تغیرات جو نئے علوم کے توسط سے ہر معاشرے میں ہو رہے ہیں۔ مشکل تر اجزاء کی سمیٹ چاہتے ہیں ایک ایسے معاشرے میں جو ترقی پزیری کی طرف مائل ہوتے ہوئے بھی نئے تعصبات میں گھر جاتا ہے، شاعری میں توازن برقرار رکھنا آسان نہیں ہے۔ شاعری کا نیا دور فیض، مجاز اور راشد سے شروع ہوا تھا تو اس میں ان تقاضوں کی معیاری آگہی تھی جو ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شعرا سے ہوتی ہوئی ۷۰ء کی دہائی کے شعرا تک پہنچی ہے۔ آنے والے دور میں شعرا پر سماجی شعور کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ مسائل بھی پیچیدہ ہیں اور ذہنی سکت کا مطالبہ بھی سخت تر ہے۔ ان سب باتوں کا احساس پیرزادہ کے کلام میں ملتا ہے

کیا کوئی فرد کا غم اس کو نظر آگیا چہرہ امروز سے آج بحالی گئی
شعلہ بجاں عشق کا کیا یہی انجام ہے آگ بھجادی گئی، راکھ بچا لی گئی
”راکھ بچا لی گئی“ کا گہرا طنز ماحول پر تنقید ہے جس کی اور مثالیں بھی ہیں :
شعلہ اظہار شوق کیسے نمودار ہوئے اس پہ تو ہر دور میں خاک ہی ڈالی گئی

دست نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر پہلے جو آگ لگی ہے وہ بھجادی جائے

ہمارے معاشرے کے پست و بلند میں حادثات و واقعات کا ایک ایسا تسلسل ہے کہ کچھ علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں۔ ہر زندہ تہذیب اپنی اقدار کے اندر نئی چیزوں کو سمیٹنے کی ایک مقناطیسی قوت رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پیچھے رہ جاتی ہے۔ اس کا پیمانہ صنعت و حریت۔ نئے علوم کی پاسداری۔ نئی فکر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور نئی فکر کو قبول کرنے کا معتبر ترین اظہار شعر و ادب ہے جس کا زاویہ کل کے مقابلے میں آج دوسرا ہے۔ پیرزادہ کے کلام میں یہ زاویہ چند علامتوں میں آتے رہتے ہیں۔ اسی نوع کی ایک علامت سے ان کے مجموعے کا نام ”تند ہوا کے جشن میں“ منتخب کیا گیا ہے۔

تند ہوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے مگر
تن سے کوئی قبا چھنی سر سے کوئی ردا گئی

دل زدگاں کے قافلے دور نکل چکے تمام
ان کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

انہی چند علامتوں کو انہوں نے اپنی دو غزلوں میں جو کلام کے ابتدائی حصے میں آتی ہیں، دہرا کر اپنی فکر کا پس منظر اور حاصل دونوں سامنے کر دیا ہے۔ جو روایت اور تسلسل فکر بھی ظاہر کرتا ہے۔ روایت اور تسلسل فکر میں جب تک کوئی دوسرا زاویہ نہ آجائے فکر رک جاتی ہے۔ شاعر تو اپنی ذات میں ایک متحرک ذہن رکھتا ہے جس کا ثبوت آج بھی ۱۹۳۰ء کی دہائی کے موجودہ شعرا علی سردار جعفری، جذبی، احمد ندیم قاسمی اور

اور اختر الایمان کے کلام میں جاری ہے اور اس کی دوسری کڑی ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شعر مجروح سلطان پوری جمیل الدین عالی، ضیا جالندھری، منیر نیازی، حبیب جالب اور ان کے ہم عصروں میں ہے۔ اسی سلسلہ گویائی کی کئی نئی آوازیں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں بھی ہیں۔ پیرزادہ قاسم کی آواز، ان آوازوں میں ایک آہنگ رکھتی ہے جو لطیف سے لطیف تر ہوتا چلا گیا ہے

مجھے جب پروفیسر سحر انصاری نے ”تند ہوا کے حبش میں“ کی کاپی دکھائی تو بہت خوشی ہوئی۔ اس وقت لکھنے کی کوئی بات نہیں نکلی۔ تین چار ماہ بعد پھر پیرزادہ قاسم اور سحر انصاری نے مسودہ دیکھنے کو دیا۔ میرے علم میں یہ بات بھی آئی کہ اردو کے وقیع اور مستند نقاد اور ادیب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور پیرزادہ قاسم کے ہم نواؤں میں نہایت ہی معتبر شاعر اور نقاد سحر انصاری کے مضامین کے ساتھ ان کا کلام شائع ہو رہا ہے۔ ان کے کلام کے شائق اور عام قاری ان مضامین کی روشنی میں اس کی معنویت کو سمجھ سکیں گے۔ میں نے تو فرصت کی چند ساعتوں میں اس کی ورق گردانی کر کے اس کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

گواہی

پیرزادہ قاسم کا نام ہی اُن کی شخصیت اور شاعری کا اشاریہ ہے۔ پیرزادگی میں قناعت دنیا سے بے نیازی، درد مندی، انسانوں اور کائنات سے رشتہ مودت اور اپنے رب کی ذات کو اپنی شہ رگ میں محسوس کرنا۔ یہ سب پہلو اور زاویے موجود ہیں اور ان کی شاعری لفظوں کے وسیلے اور واسطے سے انہیں تمام باتوں اور اعلیٰ قدروں کی تقسیم کا سلسلہ ہے۔ یوں شاعری خیر، حسن اور صداقت کو عام کرنے کا عمل بن جاتی ہے۔ نہایت شدید حبس کے عالم میں یہ سطر لکھتے ہوئے خیال آیا کہ شاعری کا ایک وظیفہ یہ بھی ہے کہ فضا اور معاشرہ پر چھائے ہوئے حبس اور رگ رگ میں پھیلتی ہوئی بے دلی اور بد دلی کے عالم میں ہمیں نشانہ کار اور آہنگ حوصلہ عطا کرے، اور جب یہ نکتہ سمجھ میں آجائے تو پھر آدمی کو حبس میں لو کی دُعا مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

میں نے پیرزادہ کی شخصیت اور آواز کو مرحلہ ہائے شوق طے کرتے دیکھا ہے۔ ان کی خوش نوائی خوش گوئی، خوش فکری اور خوش عملی کے ارتباط کو ان کی شاعری کے قالب میں ڈھلتے دیکھا ہے۔ یہ تحریر ایک گواہ کا بیان ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ گواہ ایک معتبر گواہ ہے۔ پیرزادہ کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ اور احاطہ اس وقت میرا مقصد نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ مجموعہ ان کے ایک استاد اور ہر دور میں اُن کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے ایک شخص کی شہادت کے ساتھ شائع ہو۔

ایک مرحلے پر پیرزادہ قاسم کے اس شعری مجموعہ کا نام ”ایک دیباچھا ہوا“ تجویز ہوا تھا۔ سبب ظاہر ہے کہ یہ ردیف اُردو دنیا میں پیرزادہ کی شناخت بن گئی ہے۔ اپنی زبان کی کسی ترکیب اور کسی اظہار کو اپنی شناخت بنا لینا اپنی انفرادیت کے اعلان اور اظہار کی طرف پہلا بڑا قدم ہے۔ ایسا قدم جو اپنے آپ میں جست کے امکانات رکھتا ہے۔ لیکن اس نام سے منفی پہلو کا جو احساس ابھرتا ہے (ویسے یہ ردیف اور یہ غزل منفی نہیں، اس پر آپ کو اگلی سطور میں گفتگو ملے گی) اس کا اتفاق تھا کہ کسی نئے نام کی جستجو کی جائے۔ میں نے پیرزادہ کے مزاج، انداز فکر اور اسلوب کلام کی تلاش انہی کے صحیفہ حروف میں کی اور آخر یہ نام ہاتھ آیا ”تند ہوا کے جشن میں“۔ تجھے ہوئے دیے کا رشتہ بھی تو تند ہوا سے ہے۔ مگر یہاں بات بہت دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارا دور چو طرف ہواؤں کا دور ہے۔ وہ ہوائیں جو اقدار و تمدن کے چراغ بجھائے دے رہی ہیں۔ انیس کا دور دیباچہ دار، روشنی بدست اور نور در قلب و ذہن لوگوں کا

دور تھا۔ کوئی ہاتھ میں چراغ لے کر نکلتا تو ایسی آوازیں راستہ روک لیتیں۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن ہمارے دور میں تند ہواؤں کا راج ہے۔ تیز ہواؤں کے شور اور تیز ہواؤں کی گونج
گو تند ہواؤں کا جشن "قرار دینا انسان کے ثبات کا دعویٰ ہے۔ تند ہواؤں کا جشن آدمی کی شکست کا
پہلا باب بن سکتا تھا کیونکہ ان ہواؤں نے ہمارے عہد سے ذوقِ نغمہ نازک چھین لیا ہے۔ اس سے پہلے بھی
ایسے دور آئے ہیں کہ نغمہ گروں کو کہنا پڑا ہے کہ :

نوار تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

لیکن پیرزادہ قاسم جیسے شاعر تند ہوا کے جشن میں "اپنے لہجے کی نغمگی کو برقرار رکھتے ہیں اور
یوں اپنے عہد کی گراں گوشتی کو حسنِ سماعت کا تحفہ دیتے ہیں۔

اے عہدِ گراں گوش ترا حسنِ سماعت ہم سے ہے کہ اک شور مچاتے ہی لہے ہم

اپنے نغمے کو شور کہنا انکسار بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ نغمے کے لطن ہی سے وہ شور
معنی خیز ابھرتا ہے جو تند ہواؤں کے جشن کو بامعنی بنا دیتا ہے۔ پیرزادہ انکسار کے ساتھ ساتھ متاع
خود شناسی کا مالک ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے عہدِ شور بکیراں میں کرب کو حرفِ سخن بنا دیا ہے۔

کرب نہاں کو کچھ ہی حرفِ سخن بنا سکے

ورنہ یہ شور بے صدا کس کی سمجھ میں آسکے

ہمارے دور کے وہ لوگ جنہیں اردو کے چالیس سالہ ادب میں کوئی فکری، تعمیری اور انقلابی آواز
سنائی نہیں دیتی، خاص طور پر اس عہدِ گراں گوش کا اشارہ بن گئے ہیں۔ اب یہ آوازیں ان کے کان
تک کیسے پہنچیں۔

بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے بھی کب تلک جیا جائے اور کیوں جیا جائے

دستِ نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے

کوئی بتائے تو سہی یہ ساعتِ چمن ہے کیا خزاں کا نام دفعۃً بہار کیسے ہو گیا

پیرزادہ قاسم چراغ، شمع، دیے کا نغمہ خواں ہے۔ ان استعاروں کو جمع کیجئے تو حاصل جمع
روشنی ٹہرتی ہے۔ خود بجھا ہوا دیا بھی روشنی کا اشارہ اور استعارہ ہے۔ پیرزادہ کی غزل :

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا

پر نظر ڈالیئے تو اس ردیف میں اثبات کے نہ جانے کتنے ہی پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ خون سے بجھے ہوئے
دیے کو جلانا (عمل) بجھے ہوئے دیے کو جلانے کے لیے قبول کرنا (ذہنی رویہ) بجھے ہوئے دیے کا

وصال سالگنا (جذباتی رویہ) جلے ہوئے اور بجھے ہوئے دیے کو ایک سلسلہ کے طور پر دیکھنا (تضاد میں وحدت کی تلاش و یافت) بجھے ہوئے دیے کی رفاقتِ شب اور بجھا ہوا دیا بھی تو اپنی ایک شخصیت رکھتا ہے۔ بجھنے سے پہلے اس نے فضا میں روشنی کی لیکر کھینچی تھی۔

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی

ویسے میری بساط کیا، ایک دیا بجھا ہوا

اور اگر بجھنے کا یہ عمل وقوع پذیر نہ ہوتا تو روشنی جاں حرفِ سخن میں کیسے ڈھلتی۔ اس بجھے ہوئے دیے کا سلسلہ نسب میرے صاحب کے والد کی اس وصیت و نصیحت سے جاملتا ہے کہ بیٹا! عشق اختیار کرو۔ یہی نورِ حیات ہے، یہی نارِ حیات ہے۔ عشق خود بھی شعلِ جاں ہے اور ہمیں بھی شمع صفت بناتا ہے (محبوبی میں نہیں، لگھلگھنے میں) یہی دیا، اقبال کی وہ شمع ہے جو سب سے جدا، سب کی رفیق ہے اور یہ شمع یا دیا تو شاعر کی ذات بن جاتی ہے۔ ویسے مری بساط کیا.... پیرزادہ قاسم کا یہ شعر اپنے پہلوؤں اور گیرائی کی بنا پر رضاعی وحشت کے اس شعر پر اضافہ اور نئے حاشیہ کا درجہ رکھتا ہے۔

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

پیرزادہ قاسم نے شمع سے اجتناب برتتے ہوئے ”چراغ“ اور ”دیا“ کو اپنی بنیادی علامت کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اس علامت اور استعارے کے تلامذے ان کی شاعری میں بڑی جامعیت اور ہمہ گیری رکھتے ہیں اور ہوا بھی ان کے رشتہ معنوی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ مجموعہ کی پہلی غزل ”دیا بجھا ہوا“ کے حوالے سے چند باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔

اب اسی حوالے سے چند اور مقامات ملاحظہ ہوں۔ زندگی بُتِ نزارِ شیوہ ہے اور شاعر اپنی بصیرت اور لفظوں کے لینس (LENS) سے اس کی اداؤں کو اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ جب وقت کی کرن ان تصویروں پر پڑتی ہے تو معنوں اور تلامذوں کی نئی جگہ گاہٹ ان نقوش کے لپٹن سے ابھر آتی ہے۔

میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ

وقت کی سازشی ہوا بچنے دیے بجھا گئی

یہاں حوصلہ اور حالات دیے کے تلامذے ہیں۔ پہلے مصرع میں چراغ، دیے سے الگ ایک

علامت ہے۔ یہ لہو ہی ہے کہ جس کی تازہ دم نے روشنی بن کر اسے چراغ بنا دیا۔

یہ آج کس کو اچانک مرا خیال آیا

چراغِ راہ میں یہ کون دھر گیا سرِ شام

یہاں چراغ کے تلامذے ہیں محبت (خیال) اور رہنمائی (روشنی) یہاں مجھے راجندر سنگھ بیدی

کی کہانی یاد آرہی ہے، ”بھولا“ جس کی معصومیت نے طوفانِ ہوا کے مقابل سر راہ روشنی رکھ دی تھی۔ روشنی نہ ہو تو معصومیت اندھیروں میں گم ہو جائے گی خواہ شاعر کی ہو یا ”بھولا“ کی :

مصیبتوں نے بے چراغ کر دیا اگر تو کیا دیا بچھا دیا گیا ہے دل تو مت بچھایے
یہاں دیا وسائل کی علامت ہے اور دل ذات کی۔ دیے کے اس تلازمے کو فعلِ مجہول نے کس طرح ابھارا ہے۔ شادِ عظیم آبادی یاد آگئے کہ ”مناؤں میں الجھایا گیا ہوں“، فعلِ مجہول کا رشتہ جبر سے قریبی ہے۔ قولہ کلیوں کے طواریک نام نہیں، یہ زبان کا تخلیقی مطالعہ ہے :

دستِ ظلمت پہ تہی نخت نہ بیعت کر لیں پھر سرِ شام دیا بھی نہ جلا یا جائے
یہاں دیے کا تلازمہ ہے حق اور جہاد اور ظلمت سے مقابلہ۔ شام اور دیے نے ہماری صورتِ حال کو شام کر بلا کی فضا عطا کر دی ہے :

یہ بات بچھتے دیوں نے کسی سے پوچھی تھی جلے تو ہم تھے مگر خیر حکم گائے کون
یہاں تو اپنے چراغوں کی فکر ہے سب کو دیا جلا یا ہے سب نے دیے جلائے کون
یہاں تو صبح سے پہلے ہی بزمِ برہم ہے دیا بجھا دے کوئی پر دیا بجھائے کون
پہلے شعر میں بچھنے کا علاقہ معنوی روشنی پھیلانے کے عمل سے ہے۔ اس عمل میں بچھنا ہنی دیے کی جزا ہے۔ رہا یہ سوال ”جگمگائے کون“۔ دوسروں میں بے غرضی پیدا کرنے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں ورنہ دوسرا شعر شاہد ہے کہ ”دیا“ جلانا بھی عملِ خود غرضی ہو سکتا ہے۔ ہمارے دور میں اپنے چراغوں کی فکر چھوڑیے۔ لوگ لاشوں کے گننے کے عمل میں بھی اپنوں اور پرائیڈوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ دیے، دوسرے شعر میں بے غرضی اور اجتماعی عمل کا اشارہ ہے۔ اور آخری شعر میں دیا بچھنا سلیقے سے بساطِ بزم اٹھانے کا عمل ہے، جو بزم کے برہم ہونے کے مقابل ہے۔

پیرزادہ قاسم نے چراغ اور دیے کی لو پر اپنا نام یوں لکھ دیا ہے کہ وقت کی سازشی ہوا اُسے نہیں بچھا سکے گی کیونکہ یہ چراغ تو اس کے لہو میں روشن ہیں۔ اُردو غزل اور غزل گو شعرا کی علامتوں اور استعاروں اور اُن کے تلازموں پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور وہ بھی شمارِ باقی طریقوں کے مطابق۔ یوں ہم جدید غزل اور غزل گو شعرا کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ خورشیدِ اسلام صاحب نے ”ابتدائی غالب“ کی تفہیم کے لیے یہ طرئی کا اختیار کیا تھا، مگر پھر کوئی حریفِ مٹے مردانگن شعر نہ ہوا۔ یہ کرنے کا کام ہے۔ یہاں یہ بات عرض کر دوں کہ میں کسی میکاکی تنقید کا کیس نہیں لڑ رہا ہوں۔ اسلوبیات اور ساختیات کے حوالے سے جو ادبی تنقید پیش کی جا رہی ہے وہ ادب کے پراسرار عمل کی تفہیم اور کسی شاعر کی عظمت کو ناپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتی۔ ادب کا اقدار کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور میکا نکیت کا اقدار سے کچھ ایسا رشتہ نہیں۔

خود لسانیات کے ذریعہ ادب کی تفہیم کا کام کرنے والے بڑے عالم اور اسکالر مغرب میں واضح طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ ہم ادبی نقاد کی نہ جگہ لینا چاہتے ہیں اور نہ ادبی تنقید کو معطل کرنا چاہتے ہیں، ہاں یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ ادب تک رسائی کا یہ نیا طریقہ بھی اپنی افادیت رکھتا ہے۔

”دیے اور چراغ“ کے علاوہ پیرزادہ قاسم کی دوسری علامتیں ”دنیا“ اور ”سفر“ ہیں۔ دنیا میں زمانہ اور وقت بھی شامل ہیں اور سفر کی بہت سی سمتیں اور جہتیں ہیں۔ بقول اقبال

ع۔ حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

پیرزادہ قاسم بھی اپنی حیات اور اپنی ذات کو سفر نصیب قرار دیتے ہیں۔ زندگی ایسا سفر ہے جس میں ہم ہر لمحہ کچھ سے کچھ بن رہے ہیں۔ تشکیل و تعمیر کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ہم اپنے کوزہ گر کے ہاتھوں میں اس تشکیلِ سفر سے گزر رہے ہیں۔ خدائی ہاتھ ہمیں بنا رہا ہے، بنا رہا ہے اور یوں ہمارے مقدّر کی تشکیل ہو رہی ہے۔

سفر نصیب ہیں ہم کو سفر میں رہنے دو

سفالِ جاں کو کفِ کوزہ گر ہیں رہنے دو

”سفالِ جاں“ کی ترکیب سے ذہن پیرزادہ قاسم کی ”لفظیات“ کی طرف منتقل ہوا۔ یہ اصطلاح سکڑ رائج الوقت ہے۔ اسے ترکیبیات کہنا شاید زیادہ بہتر ہو، اور اگر ادبی ترکیب کو ہم لفظ قرار دینے پر مضمون تو ”لفظ تراشی“ کی ترکیب شاعر کے تخلیقی عمل کو زیادہ بہتر طور پر پیش کر سکتی ہے۔ یہ ترکیبیں دراصل شاعر کی انفرادی علامتیں بھی ہیں اور اس کی شاعری میں تخیل کے عمل کا اشاریہ بھی۔ تخیل ہی شاعر کو ایسی زبان کے اختراع کرنے میں مدد دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ مختلف اشیاء کے درمیان ایسا تخلیقی ربط پیدا کرتا ہے کہ اس کے اس لسانی عمل سے ہمارا تناظر بدل جاتا ہے۔ تخیل ہی اشیاء سے آگے بڑھ کر مختلف تصورات کے درمیان مزید اضافی رشتوں کی تلاش کو حقیقت بنا دیتا ہے۔ یہ تخیل اور شاعری کی زبان کے رشتہ کی بحث کو چھیڑنے کا موقع نہیں مدتوں پہلے کولریج (COLERIDGE) نے ان نکات کو کیسے بے غبار اور واضح انداز میں پیش کر دیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تخیل اور شاعری کی زبان پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے اور ان کا رشتہ نظروں سے بڑی حد تک اوجھل ہو گیا ہے۔

اس طویل جملہ معترضہ کے لیے شاید مغذرت کی ضرورت نہیں۔ فسانہ سے فسانہ یوں ہی پیدا ہوتا ہے اور بات سے بات کے دائرے یوں ہی پھیلتے ہیں۔ کسی تبصرہ اور حاشیہ کے بغیر پیرزادہ قاسم کی لفظ تراشی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

شعلہ ہوا نژاد تھا، پھر بھی ہوا کے ہاتھ نے

بس یہی فیصلہ لکھا ایک دیا جھبا ہوا

دولہ ہائے شوقِ سب صرفِ مہاجرت ہوئے
اب سرِ منزلِ وفا ڈھونڈ رہے ہو گھر کہاں
تینِ زلیست تو سارا بے نمود لگتا ہے
دروپے نہایت کا حاشیہ نہ ہونے سے

یہ برگِ دبار بھی لے جاؤ چوبِ جاں بھی مگر
نمو کی ایک رمت تو شجر میں رہنے دو

بہت ہم کو رلایا ماضی و امروز نے سوا ب
نشاطِ گریہ ایسا ہے کہ مستقبل پر روتے ہیں

نہتے دیے کی جرات و ہمت دیکھو تو
کیسا شبِ آشام ہوا ہے حیرت ہے

پیرزادہ قاسم کی لفظ تراشی پر گفت گو کو آگے بڑھانے اور ان کے اسلوب شعری کی نقش بندی کے
عناصر کا ذکر کرنے سے پہلے DYLAN THOMAS کی ایک بات یاد آگئی جو اس نے غالباً اپنے شاعرانہ منشور
(POETIC MANIFESTO) میں لکھی ہے کہ ”میں شعر اس لیے لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے لفظوں سے عشق ہو گیا
تھا۔ لفظوں کے معنی کیا ہیں یہ بات ثانوی اہمیت کی تھی۔ جو بات اہم تھی وہ لفظوں کا آہنگ اور ان کی آواز
تھی۔ مجھے اُن رنگوں سے دلچسپی تھی جو لفظ میری آنکھوں کے سامنے بکھیر دیتے تھے۔“ یہ بات شاعر کے علاوہ
شاعر کا قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ جب اقبال کے اشعار کا مفہوم ذہن میں نہ آتا تھا تو محض اس کے لفظوں کا
آہنگ اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آلباسِ مجاز میں
یہ بات میں نے اپنے ایک مضمون ”اقبال کے ساتھ ساتھ“ میں قدرے تفصیل سے بیان کی ہے۔
پیرزادہ کے ہاں لفظوں کا آہنگ دیکھئے :

کیا سرو قدی قامتِ فن یوں ہے کہ جیسے
سائے رہیں سب یوں کے برابر متواتر
کیا یہی اشکِ ندامت ہے جو زخندہ ہے
آپ کی جان سے دور آپ کی مڑگاں کے قریب

میں نے لفظ و معانی کے ارتباط سے انکار نہیں کیا ہے، لیکن شاعری کے آہنگ اور رقص کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگلی سطور میں لفظ اور معنی و تخیل کے تعلق ہی کا ذکر ہے۔

لفظ تراشی سے شاعر کے تخیل، مشاہدہ اور مشاہدہ و مطالعہ کی پیوند کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی شعری روایت میں اس کے مطالعہ اور نظر کا بھی۔ پیرزادہ صاحب کی تراکیب اور لفظ تراشی سے ہی ان کی شخصیت پر میر صاحب اور مرزا نوشہ کے اثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میری طرح دشت بھی مجبور ہے اس کو بھی اک خاک بسر چاہیے
میر کے انداز سخن کے لئے صرف مہنر کیا ہے، جگر چاہیے

کیا باک مجھے صدق کے اظہار میں آوے غالب کا ہے فیضانِ جوا شعار میں آوے

شاید مجھے وہ بھول گیا ہے کہ ناگہاں اُن کی شکستِ شیشہ دل کی صدا ابھی
پیرزادہ قاسم نے اُردو غزل کو اُردو غزل بنانے والے دونوں شاعروں کی صحبت میں ادب اور توجہ کے ساتھ اپنا وقت گزارا ہے اور ان دونوں کی شاعری اور ذات کو کس اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ میر صاحب نے مہنر اور جگر داری کے پھول اپنی ذات کی شاخ پر کھلائے ہیں۔ جو آدمی عیب کرنے کے لیے مہنر کا تقاضا کرے اس کی معیت میں ماہ و سال گزارنے کے لیے جگر چاہیے۔ اور ہمارے مرزا صاحب کا تو دعویٰ ہے۔
ع کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اور اسی کے ساتھ شاعری میں صدق کے پیرایے۔ ”ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے“ اور کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملا لیں یا رب“ سامنے آتے ہیں۔

ہمارے عہد کی شاعری پر فیض احمد فیض کے فیضان سے کون انکار کرے گا۔ پیرزادہ صاحب بھی اس جادو سے کیسے بچتے۔ فیض نے اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی تھیں اور جب بات پیرزادہ قاسم تک پہنچی تو یاروں نے ان کے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر داستانِ رقم کر لی۔

کس مہنر سے یاروں نے داستانِ رقم کر لی
میرے خونِ دل میں ہی انگلیاں ڈبونے سے

میں نے پیرزادہ قاسم کو مشورہ دیا تھا کہ یہ شعر شامل نہ کریں۔ دوسرے مصرعے کی کمزور نشست کے علاوہ ایسا راست اثر۔ آخر کیوں؟ لیکن مجموعی طور پر پیرزادہ کی شعری لغت اور بیان پر فیض کی ویسی چھاپ نظر نہیں آتی جس کی مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی، احمد فراز اور رضی انتر شوق کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ (دیے درد، غم اور چاند کے بچنے سے وہ بھی بھاگ نہیں سکے) ان کا لہجہ جو فیض سے گزرتی ہوئی ہوا کی طرح ہے جو نرمی میں فیض کی یاد دلاتا ہے مگر ان کی نغمگی شخصی ہے اور یہ انہیں، ”درد کی زمینوں میں غم کی فصل بونے سے“

حاصل ہوئی ہے۔ فیض کی مشہور تراودر دست صبا اور اس کے بعد کی غزلوں کی نغمگی، فارسی غزل کی یاد دلاتی ہے اور اسی کے ساتھ قافیوں کے حسن سے نغمہ و صوت کی کلیاں چمکتی ہیں۔ پیرزادہ قاسم کے ہجے کو ان کی زمینوں نے واضح شکل دی ہے۔ وہ ردیفوں پر یوں تصرف کرتے ہیں کہ نئی زمینیں ایجاد ہوتی ہیں۔ ویسے نشاط گریہ کے ہجے کو انہوں نے ایک جگہ فغار، کہا ہے۔ یہ فغاں لغت کی فغاں نہیں ہے بلکہ وہ فغاں ہے جس کا پیام شاعر کو آتا ہے۔

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
اور پیرزادہ نے سچ کہا ہے کہ یہ فغاں اعجاز ہوتی ہے
بھلا یہ آہ و زاری شعبہ بازوں کے بس کی ہے
فغاں اعجاز ہوتی ہے، فغاں ایجاد کیا کرتے
میں نے ادبی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے تیسرے، غالب اور فیض کا ذکر کیا تھا، لیجیے آہ و فغانِ نیم شب کی سطح پر اقبال بھی سامنے آگئے۔ اقبال کے نزدیک سخن وری ”کہنی“ اور ”ان کہنی“ دونوں سے عبارت تھی۔

پردہ اٹھا دوں اگر چہرہ افکار سے
لانہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو
یہی وہ منزل ہے جس کے مضافات میں پہنچ کر پیرزادہ قاسم کو کہنا پڑا ہے
نہ پوچھیے کہ کہا کیا ہے، ان کہی کیا ہے
عذاب جھیل رہا ہوں سخنوری کیا ہے

پس نظر ہو اگر مقصدِ حیات تو پھر
یہ زلیست وقت گزاری ہے زندگی کیا ہے

افراد اور قومیں آرزو اور مقصد ہی سے زندگی پاتی ہیں۔ یہ نکتہ پیرزادہ نے زندگی کے علاوہ اقبال سے بھی سیکھا ہوگا۔ یہ ایک نئے تصوف کی نشان دہی بھی ہے۔ ایک تصوف تو وہ تھا جس میں اقبال کو ”محکومی و مسکینی و نو میدی جاوید کے عناصر نظر آئے، اور دوسرا تصوف وہ ہے جو شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلتا اور جہوتِ شاہی کے پردوں کو چاک کرتا تھا۔ اسی کے نمائندے معین الدین چشتیؒ اور مجدد الف ثانی تھے۔ یہی تصوف نظام الدین اولیا کی پیشانی پر دربار شاہی سے بے نیازی کی صورت میں خورشید بن کر چمک رہا تھا۔ ایسا تصوف خدا اور خودی کو کس طرح ہم آہنگ کرتا ہے، اس کا پیرزادہ کو

دراک ہو چکا ہے۔ ابھی ان کی زندگی میں تو یہ رنگ ابھر کر نہیں آیا مگر ان کے لہو میں ان کے اجداد کی مبارزت
لبی کی صدا میں سن رہا ہوں۔ بات ہو رہی تھی ادراک خدا اور خودی کی، سو یہ شعر سنئے :

شعورِ حق پہ بہت گفتگو ہوئی لیکن
شعورِ ذات ہی ہر گفتگو کا حاصل تھا

زمین ایجادِ دی اور اس کا سلسلہ پیرزادہ کی فکر اور شخصیت کے ایک نمایاں عنصر تک جا پہنچا۔
زندگی کی طرح خیال بھی شاخ در شاخ اپنی نمود اور نمو چاہتا ہے۔ فعاں کا تعلق اعجاز سے ہے، مگر اظہار تو ایجاد کے
رحلوں سے گزرتا ہے۔ اسی ایجاد میں طبعِ خدا داد کے ساتھ ساتھ خونِ رگ معمار بھی شامل ہے۔ پیرزادہ کی
غزل کی ان زمینوں کو دیکھئے :

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا

میانِ کارِ فنِ لفظوں کی قسمت جاگ اٹھتی ہے

کسی نے اک حرفِ زلیست پہیم ہوا یہ تحریر کر دیا ہے

میرے کام بہت آتا ہے اک انجانا غم

چاند بھی بجھا ڈالا دل دکھانے والوں نے

کارِ خلوصِ یار کا مجھ کو یقین آ گیا

دیر سے تیز رو تو ہم خاک و ہوا کے ساتھ ہیں

ردیفوں کی یہ نشان دہی اس مجموعے کے ابتدائی صفحات سے کی گئی ہے۔ بالعموم طویل ردیفوں کی
اساس فعل ہوتا ہے اور یوں تسلسل پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پیرزادہ قاسم کے ہاں افعال کے ساتھ ساتھ
ایسی زمینیں بھی ہیں جن میں فعل کی جگہ اسم یا اسم اور صفت یا فعل ناقص کے امکانات کو ابھارا گیا ہے۔
پہلی ہی غزل، ”ایک دیا بجھا ہوا“ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ ”اک انجانا غم“ اور ”چاند بھی بجھا ڈالا دل
دکھانے والوں نے“ دوسری مثالیں ہیں۔ پیرزادہ قاسم یوں بھی کہہ سکتے تھے :

دل دکھانے والوں نے چاند بھی بجھا ڈالا

لیکن یوں نحوی زور (STRESS) بدل جاتا اور بجھانے کا عمل، دل دکھانے والوں پر غالب آ جاتا۔ دوسری بات
یہ کہ دل دکھانے والوں کا دائرہ عمل کیسے سامنے آتا۔ دل دکھانے کے کتنے پہلو، گوشے اور زاویے ہیں اور

پھر یہ دل دکھانے والے تو وہ ہیں جو ہماری دُعاؤں کا مرکزی کردار بھی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ہماری زندگی کو درد کی معنویت اور دل گرفتگی کی صفت عطا کرتے ہیں۔

ہم نے خستگی پائی، دل گرفتگی پائی
خیر ہم سے کیا پایا دل دکھانے والوں نے

دوسرے مصرعے کا زیر لپی لہجہ اور تحت بیانی (UNDER-STATEMENT) آج کی غزل میں آسانی سے ملنے والی خصوصیات نہیں۔ اس کے لئے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے۔ یہ میر صاحب کا ورثہ ہے اور اسے پانے کے لئے محبت کے ظلمت سے نور کاڑھنے کی تفہیم کے مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔

پیرزادہ قاسم نے طویل ردیفوں کے بغیر بھی مسلسل غزلیں کہی ہیں:

کدورتوں کے درمیان، عداوتوں کے درمیان

میانِ کارِ دنیا ہم سے دلِ ناشاد کیا کرتے

نغمہ نے سے خروشِ بیکراں پیوند ہو

ملتے ہی گئے خضر سے رہبر متواتر

”کے درمیان“ کی ردیف صورت حال اور مختلف صورت ہائے حال کے تضاد کو گرفت میں لینے کا شاعرانہ اور فنی وسیلہ ہے۔ شاعر میں قوی جذبات اور فطری سرعتِ حسن و فکر کے ساتھ اگر غزل کی ترکیبِ صنفی اور حرقت (CRAFT) سے باخبری ہو تو آگینہ تندئ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے۔ ردیف اور قوافی اندھے کی لائٹھی بننے کی جگہ خیال کی ترسیل اور نغمگی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی چوٹیاں سر کرنے والے شاعر کی غزل کو ہند بن جاتی ہے اور جب اس پہاڑ سے آواز ہم تک پہنچتی ہے تو وہ ہمیں اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے۔ کتنا عجیب ہے یہ کوہِ ندا کہ سننے والا اس کی طرف بھاگنے کی بجائے اپنی ذات کی سمت سفر کرنے لگتا ہے۔ غزل کو فراق صاحب نے انتہاؤں کا سلسلہ (A SERIES OF EXTREMES) کہا تھا۔ پیرزادہ

کی یہ غزل اس قول کی مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے

کدورتوں کے درمیان عداوتوں کے درمیان

تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیان

شعورِ عصر ڈھونڈتا رہا ہے مجھ کو اور میں

مگن ہوں عہدِ رفتگاں کی عظمتوں کے درمیان

پیرزادہ کے ہم عصروں میں شاید کسی اور شاعر کے ہاں غزل کے فن اور حرقت کی ایسی نمود نہیں ہے۔

اسی کو کبھی استادانہ اسلوب کہا جاتا تھا۔ یہ دراصل ہیرا تراشی کا فن ہے۔ لفظوں، ردیفوں اور قافیوں کو اپنے مقاصد کے لیے تراشنا اور یوں کہ لفظ ہشت پہلو ہیرا بن جائے خونِ دل کے صرف اور اساتذہ کی مدد سے زبان کے امکانات کی تفہیم کے بغیر ممکن نہیں۔ GARY SNYDER نے کہا ہے کہ شاعری ایک سماجی اور روایتی فن ہے جو ماضی اور خاص طور پر زبان سے وابستہ ہے۔ یہ ہمارے لاشعور کی گہرائیوں سے رابطے کا وسیلہ ہے۔ کس نے اپنا اظہار کس طرح کیا یہ مسئلہ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ ہم کس گہرائی اور قوت سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھا اور بُرا شاعر اپنا اظہار نہیں کرتا بلکہ ہم سب کا اظہار کرتا ہے۔ مجھے اس خیال سے ایک حد تک اتفاق ہے۔ اگر ہمارا مغربی شاعر غزل سے واقف ہوتا تو یہ نکتہ اس کے سامنے آ جاتا کہ شاعر کا اظہار کس طرح ہم سب کا اظہار بن جاتا ہے۔ ہاں اس بات کو کم سمجھا گیا ہے کہ لفظ کس طرح ماضی اور ہمارے عہد کے درمیان پُل تعمیر کرتے ہیں۔ پیرزادہ کے شعر میں ”مغزل“ اور ”بحالی“ کو دیکھیے کہ کس طرح کئی عہد اس شعر میں سنائی دے رہے ہیں:-

خندہ مغزل ہوا لب سے جواک بار تو پھر
کٹ گئی زلیست مگر حکم بحالی نہ ہوا

پیرزادہ قاسم کو شہرت اور وہ بھی مشاعروں کی شہرت خراب نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت کے خلاف اپنا دفاع کرتے رہے ہیں:

عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

پیرزادہ نے ایجاد اور اعجاز کے نکتے کو بھی سمجھا ہے اور شہرت کی خاطر انہوں نے نہ اپنی قربانی دی ہے اور نہ اپنے فن کی۔

جن غزلوں کے مصرعے میں نے پیش کیے ہیں اُن میں ردیف کے استعمال اور اس کے نتائج کے بارے میں طویل گفتگو کی جاسکتی ہے مگر غزل مجھ سے اختصار اور ایجاز کا مطالبہ کر رہی ہے۔ پیرزادہ کے اس مجموعے میں غیر مُردف غزلیں بھی ہیں اور یہاں قوافی کی ہم صوتیت و فضا کی تشکیل و تعمیر میں مصروف نظر آتی ہے۔ ایسی فضا جس کی حُزنِ نبیہ لے اور روشنی میں شاعر کی درد مند شخصیت براگندہ نقاب نظر آتی ہے۔ غزل تو زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا بہانہ بن جاتی ہے ورنہ شخصیت کا توازن بکھر کر رہ جائے۔ پیرزادہ قاسم کے ہاں جینے کا یہی بہتر ہے جو ادبی سطح پر ان کی غزل بن گیا ہے۔

اب تو یہی موسم ہے اور قریۂ جاں اپنا
کچھ درد کی چپکاریں کچھ زخموں کی گل کاری

پیرزادہ کی زندگی اور غزل شائستگی اور شائستہ لہجے سے عبارت ہیں۔ یہ شائستگی ان کے توازن کے سبب ہے۔ اسی شائستگی سے کارِ غم اور کارِ جہاں کے منگامے ان پر سہل ہوئے ہیں۔ ان کی غزل میں آج کی

اجتماعی فضا اور ماحول کا عکس اور بازگشت موجود ہیں، لیکن ماحول کا انتشار، ان کے ہاں فکری، جذباتی یا فنی انتشار نہیں بنا ہے۔ آج کے بہت سے لکھنے والے، بالخصوص جدیدیت کے نقیب، زندگی کی لالیعنیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے فن کو ”لالیعنیت“ کا سہل قرار دیتے ہیں۔ وہ لوگ کہ فن کی اقدار اور قوت دونوں پر یقین رکھتے ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ ادب محض زندگی کی نقالی یا عکاسی نہیں بلکہ زندگی اور اس کی اقدار عالیہ کی باز آفرینی ہے۔ خود انسانی زبان باز آفرینی اور انبساطِ روحی و معنوی REGENERATION کی سب سے جامع اور وسیع مثال ہے۔ (یہ الفاظ جو میں نے اس مطالعے میں لکھے ہیں اس ترتیب سے پہلے کبھی نہیں لکھے تھے اور نہ آپ نے پڑھے تھے، لیکن ہم ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کی گفتگو بھی اسی باز آفرینی کی مثال ہے۔ اور تحریر و تقریر میں لفظ کبھی علامت بن جاتا ہے اور کبھی استعارہ، لیکن قاری اور سننے والے سیاق و سباق اور لفظ کے معنوی مضمرات کی وجہ سے بات سمجھ لیتے ہیں) پیرزادہ کی غزل میں ہمارے آج کے اجتماعی حالات کا عکس ہی نہیں اس کی تاویل و توجیہ بھی ہے اور اس پر تبصرہ بھی، اور یوں کہ ہم حالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ تجربہ شاید آج کے حالات کے سوا کسی اور ذریعہ سے شاعر کی زندگی اور ہماری غزل میں نہیں آ سکتا تھا۔ سو اس شعر پر غور فرمائیے :

اب تو میرا دشمن بھی میری طرح روتا ہے
کچھ گلے تو کم ہوں گے ساتھ ساتھ رونے سے

ایک اور غزل کے دو شعر دیکھیے۔ پہلا شعر تو بحیثیت قوم ہماری آج کی حالت کا عکس اور اس پر تبصرہ ہے اور دوسرے شعر میں کراچی کے نسلی فسادات کو پڑھیے۔ فسق ہوا ہے تو اتنا کہ ”سال“ کی شرط ختم ہو گئی۔

جی چھوڑ کے بیٹھا ہو جو قافلہ رستے میں اب اس کی بلا جانے ہو جس کی ہوسالاری
ہر سال لگاتے ہیں ہم پود کدورت کی ہر سال ہی کرتے ہیں ہم دل میں شجر کاری

اسی حوالے سے ان دو اشعار پر بھی نظر ڈالیے :

بے زمین پودے بھی لہلہائے ہیں کیا کیا
ہم بھی زخم کھا کھا کر مسکرائے ہیں کیا کیا
اپنی مٹی میں ذرا اور میں رچ بس جاؤں
ہاں ابھی اور مرا خون بہایا جائے

ہر قابل ذکر شاعر کے ہاں آپ کو ”لازماتی“ اور ”زمانی“ اشعار ملیں گے۔ لازمانی سے مراد ایسے اشعار ہیں جو کسی عہد میں بھی کہے جاسکتے ہیں۔ ان کا رشتہ انسان کے بنیادی اور اساسی جذبات اور مسائل سے ہے، کائنات اور انسان کے رشتہ سے ہے، انسان اور انسان کے رشتہ سے ہے، انسان اور خدا کے

رشتے سے ہے۔ ایسی شاعری میں بھی اس بات کا امکان رہتا ہے کہ عصری فکر اور اندازِ نظر کے عناصر شامل ہو جائیں۔ زمانی شاعری سے مراد وہ شاعری ہے جس میں کسی عہد کے مخصوص مسائل شاعر کی ذات کے فلٹر سے چھن کر اظہارِ پائیں۔ اوپر کے اشعار اس کی مثال ہیں۔ پیرزادہ صاحب نے صرف اپنے عہد کے پاکستان اور کراچی کی اجتماعی فضا تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے اور صرف خارجی حالات (اُن امان وغیرہ) ہی کو اپنی غزل کا ہدف نہیں بنایا ہے بلکہ اس عہد کے فکری مسائل کو بھی غزل کے دائرہ میں شامل کر لیا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

عجب بُہرے کہ دانش وری کے پیکر میں
کسی کا ذہن، کسی کی زباں لیے پھرے

یہ صرف پاکستان کا نہیں تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کا المیہ ہے کہ اس کے دانش ور مانگے کے اچالے میں اپنے ماہ و سال گزار رہے ہیں۔ کسی کا ذہن بائیں بازو کا ہے کسی کا دائیں بازو کا۔ اور تو اور ہمارے ملک اپنی زبانوں سے بھی محروم ہیں۔ ہم دوسروں کی اصطلاحوں میں سوچ رہے ہیں۔ آج سائنس نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے اور زمین کی طنائیں کھینچ دی ہیں۔ ساری دنیا انجیلِ تقدس کے اظہار کے مطابق ہزار کروں کا مکان بن گئی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کی زد میں ہیں اور اتنی قوت، وسائل اور امکانات رکھنے والے انسان نے اپنے افکار کی دنیا میں سفر نہ کر سکنے کی وجہ سے زندگی کی شبِ تاریک کی ظلمتوں میں دھوئیں اور دھماکے کا اضافہ کر دیا ہے۔

غبارِ بارود، رقصِ شعلہ دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشورِ امنِ عالم ہوا یہ تحریر کر دیا ہے

موت کے سوداگر جو عالمی اقتدار کے ایوانوں میں خوشنالبا دوں میں ملبوس براجمان ہیں، انسانی مستقبل سے کس طرح کھیل رہے ہیں۔ اور اس ماحول میں حرف کی قندیلیں روشن کرنے والے بہر حال خاموش نہیں ہیں۔ ان کا شعلہ آواز، رقصِ شعلہ کے خلاف محاذ آرا ہے۔

پیرزادہ کے فن اور فکر پر ان کی غزل کے حوالے سے چند باتیں عرض کی گئیں۔ وہ اپنی ذات سے قریب ہیں اور اسی ذات کے حوالے سے حرفِ غزل پیش کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنی ذات کو اپنا زنداں نہیں بنایا ہے۔ جو دیوار بھی ان کے سامنے آتی ہے وہ اس میں درپیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی غزل اسی عملِ تسخیر اور سفرِ مسلسل کی داستان ہے۔ ان کے عملِ تسخیر کی تمنا اور آخری منزل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مسخر کر لے کائنات کو تو وہ مسخر کر ہی رہا ہے مگر اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ اگر اپنے اندھے ارادوں اور بے سمت خواہشوں کو انسان نے بصیرت اور سمت نہ دی تو یہ دنیا ایک دھماکے سے ختم ہو جائے گی۔ اور دوسری طرف اس سفرِ مسلسل میں تعمیرِ دوست اور تعمیرِ پسند فنکار اپنے وجود کی نفی کرتے ہوئے اپنے بطون کو نورِ قدیم کا ممکن

کرن وہ نور کی کس طرح روح تک آتی
کہ راہ وصل میں میرا وجود حائل تھا

مگر یہ معاملہ وجود کو مٹانے کا نہیں اسے شفاف کرنے کا ہے، بدلنے اور نئے قالب میں ڈھالنے کا ہے۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری کے بارے میں جو چند باتیں پیش کی گئیں ان کو اگر سمیٹوں تو یہ کہوں گا کہ ان کی غزل ان کے ذہن کے عقلی و ظیفی اور تخلیقی جوہر سے عبارت ہے۔ یہ پوری ذات کی شاعری ہے اور یوں پیرزادہ ان شاعروں میں شامل ہیں جن کا حرف غزل کا جواز ہے۔ میں نے کہیں یہ بات عرض کی ہے کہ غزل کو اپنا اظہار بنانا تہذیب اور تخلیق کا نکتہ آخر ہے، کیونکہ غزل میں ہماری صدیاں سمٹ آئی ہیں اور یہ تہذیبی ارتکاز شاید ہی کسی زبان کی کسی صنف میں مل سکے۔ غزل ایک متمدن اور مہذب صنف ہی نہیں بلکہ یہ ربط و تہذیب کا درس بھی دیتی ہے۔

اس مجموعے میں غزلوں کے بعد آزاد نظمیں اور چند نثری نظمیں بھی ہیں۔

غزل ہماری دنیائے شاعری کی شہزادی شہزادہ ہے۔ غزل کے وسیلے سے ہمارے بہترین تخلیقی ذہنوں نے اپنا اظہار کیا ہے اور یوں کہ حیات و کائنات کو نئی معنوی سطحیں مل گئی ہیں۔ غزل لفظ، نظر اور انسانی فکر و احساس کا سنگم ہے مگر یہ سچ ہے کہ غزل پوری زندگی نہیں۔ بعض خیال اور جذبے اپنے اظہار کے لئے دوسرے سانچوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ابھی پیرزادہ قاسم اس مرحلے پر نہیں پہنچے کہ طویل نظموں کے ذریعہ اپنے مربوط، مرتب اور زیادہ پیچیدہ خیالات کا اظہار کریں۔ ابھی وہ بنیادی طور پر غزل کی نقش گری میں مصروف ہیں۔ غزل چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص رقم کرنے کا عمل ہے اور یہ فن عظیم اور بلند و بالا محرابوں اور عمارتوں کی پیشانی پر آیات قرآنی، طغریٰ اور تاریخیں لکھنے کے فن سے مختلف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب پیرزادہ قاسم طویل نظمیں لکھیں گے تو وہ وقت کی محراب اور اس کے ایوان کی پیشانی پر ثبت کی جانے والی تحریروں کے مثل ہوں گی۔ اس یقین کا سبب یہ حقیقت ہے کہ پیرزادہ شخصی احساس کے مالک اور تصوف کی روایت کے امین ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی علم بھی رکھتے ہیں جو ماورائیت اور طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے بوجھ کو برداشت کر سکتا ہے اور یہ نئی شاعری کا مقدر ہے کہ وہ انسان اور کائنات کے پورے بوجھ کو اپنے کا ندھوں پر سہا رکھے۔

پیرزادہ قاسم کی کئی مختصر نظمیں ایسے خطوط کی طرح ہیں جو کسی کو بھیجے نہ جا سکے یا وہ ایسی گفتگو اور ایک طرفہ مکالمہ ہیں جو نظر کی زبان سے ادا کیا گیا اور بھر کا غز پر حروف کی صورت اختیار کر گیا :

تمہاری بند مٹھی میں
یہ کیسی خاک ہے جس میں

مری خوشبو ہے
میرا رنگ ہے
اور لمحہ لمحہ سرد، ہوتی زندگی کی
کچھ حرارت ہے
میں پوری نظم نقل کرنے جا رہا تھا مگر خیال آیا کہ ”ایک مفرد مکالمہ“ آپ پڑھ ہی لیں گے،
اور
میرا سخن اب خاموش ہے
میرا لہجہ بے سخی ہے
تم چاہو تو یہ لہجہ، یہ بے سخی
تم بھی اپنا لو (بے سخی)

یہ سارے لفظ، لفظوں کی جگہ خیال کا روپ نظر آتے ہیں، مگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ لفظ کے بغیر آدمی سوچ نہیں سکتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فکر کا عمل زبان کے تابع نہیں اور کچھ یہ سوچتے ہیں کہ آدمی خواب بھی زبان سے آزاد ہو کر نہیں دیکھ سکتا۔ بہر حال یہ بے سخی بھی سخن بن کر ہم تک آگئی ہے۔
پیرزادہ کی زیادہ تر نظمیں دل کہانی ہیں مگر وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ شاعر اپنی ذاتی کہانی کو انسان کی کہانی بنا دیتا ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے شعرا نے جس جس اسلوب اور پیرایوں اور حسن سے بیان کیا ہے مغرب کی تنقید بیان کی اس سطح تک نہیں پہنچ سکی۔
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نئے لے کر

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے جو سنت ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
”اور عشق کہانی“ تنک۔ اگر کوئی شخصی تجربہ انسانی تجربہ نہ بن سکے تو وہ ادبی تجربہ، اظہار اور حقیقت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہمیں کیا پڑی ہے جو دوسروں کی محبت کے قصے پڑھیں یا دوسروں کے دکھ درد کو اپنائیں اگر وہ ہماری محبت اور دکھ درد نہ بن سکیں۔ غالب کے خطوط میں ان کی جسمانی معذوریوں، آب و ہوا سے دوری، گھری چارپائی، موسم کے شدید اور قرض خوابوں کے تقاضے، سب انسانی تجربات بن جاتے ہیں اور ہم غالب کے لکھے ہوئے لفظوں میں انسانی مقدر اور انسانی مجبوریوں کو تلاش کرتے لگتے ہیں۔ پیرزادہ نے ”عشق کہانی“ میں یہ سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ سلیقہ، حسن اور قوت کے ساتھ۔

یہ مختصر نظمیں خیال اور فکر کے وہ بیج ہیں جن میں خیال و فکر کے قد اور درخت سو رہے ہیں۔ اب اچھی مٹی، سازگار موسم، معتدل بارش اور حیات بخش دھوپ ملے تو یہ چھپے ہوئے اور سوئے ہوئے درخت سوتے سے جاگ اٹھیں اور کھیلانے لگیں اور بیج کے حصار کو توڑ کر آزاد فضاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ لیں۔

اس مجموعہ میں نثری نظمیں بھی ہیں۔ میں ایک صنف ادب کے طور پر نثری نظم کے خلاف نہیں لیکن میری دانست میں یہ صنف اپنے ن۔ م۔ راشد کے انتظار میں ہے۔ اب تک تو نثری نظم کے نام سے جو نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں وہ نقشِ بے حیات ہیں۔ بعض خواتین کی نثری نظم کی چند سطروں میں حیات کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے۔ خورشید الاسلام کی نثری نظموں کے بعد پیرزادہ قاسم کی نثری نظموں میں ایک وعدہ خفی نظر آتا ہے۔ نثری نظم جس قوت اور بے محابا اظہار کا مطالبہ کرتی ہے۔ ابھی ہمیں اس کا انتظار کرنا ہے۔

ایک بات طے ہے کہ پیرزادہ قاسم کے ہاں نثری نظم نہ تو چونکنا کی خاطر ہے اور نہ عجز کی نشانی ہے۔ پیرزادہ قاسم کی غزل ان کی قوتِ شاعرانہ اور نظم و احتیاط کی دستاویز ہے۔ خیال کی بعض لہریں آزادی طلب ہوتی ہیں اور انہوں نے ایسی ہی لہروں کی خاطر نثری نظم کی طرف رُخ کیا ہے۔ ان کی نثری نظم ان کی غزل اور آزاد نظم کے تسلسل ہی کا ایک حصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی نثری نظم پر اس سے بہتر اور غیر جانبدارانہ تبصرہ ممکن نہیں کہ :

میری آتش فکر اور شعلہ نوائی

بے حس سماعتوں سے مکالمہ کرتے کرتے

تھک گئی تو پھر

راکھ کے لہجے میں گفتگو کرنے لگی (تسل)

ان کی غزل ان کی آتش فکر کا اظہار ہے مگر مشاعرہ کے سامعین ان کی غزل کے پہلوؤں کو اپنی گرفت میں نہ لے سکے۔ اب غزل کا غنڈہ پر آکر اپنے پڑھنے والوں سے دوسری سطح پر گفتگو کرے گی، اور ان کی نثری نظم مستقبل قریب میں تھکی ہوئی گفتگو کی جگہ اپنے ماضی اور اپنے حال و مستقبل کی جائزہ گر بن سکے گی۔ خدا کرے سلیم احمد کی نظم ”مشرق“ ہماری نظم نگاری کے ایک نئے دور کا دیباچہ بن سکے اور ہم نظم کے ذریعہ اپنے ثقافتی ماضی کے ایسے آئینے تیار کریں جو نئی نسل کو اپنے خد و خال دکھاسکے، اور اپنے حال کی تفہیم شاعرانہ سطح پر ممکن ہو سکے۔ قومیں اپنے آپ کو فلسفیوں کے افکار و گفتار میں نہیں پاسکتیں۔ قوموں کے مزاج اور ثقافت کی کلیت کا اظہار شاعری کی سطح پر ہی ممکن ہے جہاں جذبات میں فکر کی استوار قدمی اور فکر میں جذبات کا آب و رنگ اور گرمی شامل ہو۔

اب کے ہمارے شعروادب کا جو موسم گل ہمارے درمیان آیا ہے، یہ مجموعہ اس کا اعلان ہے اور اس بات کا اعلان بھی کہ تندہوا کے جشن میں بہار کا رقص بے کراں شروع ہو چکا ہے۔ اس رقص کے سازینہ میں غزل کے تمام ساز موجود ہیں۔ شائستگی، ضبطِ نفس، روایات کی پاسداری، اپنا لہجہ اور اس لہجہ میں سب کی بات۔

راکھ کا لہجہ

شاعری کا ایک روپ ایسا بھی ہوتا ہے جو موسموں کے تغیر اور رتوں کی تبدیلی سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اپنے عہد کی آنکھوں میں دھنک اور کانوں میں رس گھولتا رہتا ہے۔ جب تک یہ رس زندگی کے ذائقے سے قریب رہتا ہے، شاعری کا حرف حرف اپنی تاثیر کی داد پاتا رہتا ہے۔ اکثر جب شاعری کے اس رس کا (جسے آپ شریکار رس کہہ لیجیے) تجزیہ درپیش ہوتا ہے تو اظہار خیال کرنے والے کو تسلی کی طرح ڈال ڈال اور پات پات گھومنا پڑتا ہے اور تب بھی ضروری نہیں کہ شاعری کے رس کا سارا بھید ایک ہی تسلی کے حصے میں آجائے۔

پیرزادہ قاسم کی شاعری گزشتہ کئی برسوں سے ہمارے عہد کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو آواز کی تصویر اور تصویر کی آواز کا متبادل ہنر بنا دیا ہے۔ وہ سُروں اور شبیہوں میں سوچتے اور اس سوچ کو اپنی مترنم آواز سے نغمے میں بدل دیتے ہیں۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سائنس کے استاد ہیں لیکن ان کے ہاں فنون لطیفہ اور سائنس میں اُس دُوری کا خطرہ نہیں جس کا تذکرہ سی۔ پی۔ اسنو نے اپنے مشہور تنازعہ لیکچر (TWO CULTURES) میں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچی سائنسی آگہی جس کے حصے میں آئے گی اس کو انسانی اقدار سے محبت بھی ضرور ہوگی۔ سائنسی آگہی کے زیر اثر ادب و شعر میں تخلیقی پیرایوں کی پیش کش سے یہ مراد نہیں کہ سائنس کے کلیے اور ٹیکنالوجی کے طریق کار کو نظم کر دیا جائے بلکہ سائنسی آگہی کو جمالیاتی آگہی میں تبدیل کرنے سے اس تغیر کا مزاج ظاہر ہوتا ہے جسے ہم اس صدی کے حوالے سے تخلیقی سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

پیرزادہ قاسم اس عہد کے ان چند قابل ذکر شاعروں میں سے ایک ہیں جو سائنسی آگہی کو جمالیاتی تجربے میں ڈھالنے کا فن اور سلیقہ جانتے ہیں۔ سائنس کی ایک جدید شاخ ماحولیات (ECOLOGY) ہے اور بڑے شہروں کی آبادی اور صنعتی ترقی شور اور مسلسل حرکت اور ہچل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کثافت (POLLUTION) اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس پر مقالہ لکھ کر ایک سائنسی نقطہ نظر کو پیش کرنا شاید اتنا دشوار نہیں جتنا اسے شاعری کا پیر ہن عطا کر دینا۔ صرف شاعری ہی اس مسئلے کو محسوسات کی سطح پر پہنچا کر ایک جمالیاتی تجربے میں بدل سکتی ہے۔ پیرزادہ قاسم کا یہ شعر اس پس منظر میں دیکھیے تو میری بات کچھ اور واضح

ہو جائے گی۔

اب اس فضا کی کثافت میں کیوں اضافہ ہو
غبارِ دل ہے، سودِ دل میں نہاں لئے پھرے
اسی غزل کا ایک شعر اور ہے جو عہدِ حاضر کے کئی دانش ورانہ رویوں پر خاموش تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عجب ہنر ہے کہ دانش وری کے سپیکر میں
کسی کا ذہن کسی کی زباں لئے پھرے

یہ شعر ایک نوع کا طنز تو ہے ہی لیکن اس میں اس اعتراف کے کناہیے کا بھی ایک رخ نکلتا ہے، جسے
آئن سٹائن نے الفاظ میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ”میں نے دُنیا سے جو کچھ حاصل کیا ہے اگر اسے ریزہ
ریزہ واپس کر دوں تو میں ایک کھوکھلے وجود کے سوا کچھ نہ رہوں۔“

دُنیا کی طنائیں کس قدر کھنچ گئی ہیں۔ ہر دورِ افتادہ خبر اور واقعہ اب ایک ذاتی تجربے کی حیثیت
اختیار کر جاتا ہے۔ اس سے اگر آج کے تعلیم یافتہ ذہن تخلیقی سطح پر متاثر ہو رہے ہیں تو اسے انسان کی ایک
آفاقی روایت کا طلسم نو سمجھنا چاہیے۔ لیکن زندگی ان سب شاہراہوں سے گزار کر ایسے گلی کوچوں میں بھی
لے جاتی ہے جہاں یقین اور بے یقینی، اعتبار اور بے اعتباری کی سفاک پرچھائیاں رقص کرتی ہیں۔ پھر
تہذیب، اقدارِ حیات، امن و آشتی، انسان دوستی جیسے کتابی اور نصابی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور
گرد و پیش کے حقائق پیرزادہ سے اس انداز کے شعر کہلو لیتے ہیں۔

شہر طلب کرے اگر تم سے علاجِ تیسرگی
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

ہم تو مشالِ برگ ہیں اپنا قیام و کوچ کیا
کل تھے شجر کے دوش پر آج ہوا کے ساتھ ہیں

یہ بات بجھتے دیوں نے کسی سے پوچھی تھی
جلے تو ہم تھے مگر خیرِ حکم گائے کون

پھر یہی فضا جو گھر کی دہلیز کو مسموم کر رہی ہے ایک عالمی تناظر کی طرف لے جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا
ہے جیسے اب زندگی کی سچائی اور شاعری کی سچائی میں نئے نئے آفاقی اندیشوں نے بہت فاصلے پیدا کر دیئے ہیں۔

غبارِ بارود، رقصِ شعلہ، دھماکے میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشورِ امنِ عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

جس انقلاب کی سُرخ مرے لہو نے لکھی
وہ انقلاب مری داستان بنا ہی نہیں

یہ زندگی کے تلخ حقائق ہیں، ان کا احساس ہر حساس وجود کی طرح پیرزادہ قاسم کو بھی ہے اور اس کے شعری اظہار میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو کئی جگہ اُجاگر کیا ہے لیکن ایک باشعور انسان کی حیثیت سے انہوں نے اس عہد کی بعض سچائیوں کا تجربہ بھی کیا ہے جس کی وجہ سے اُن کے مجموعی مزاج میں کلبیت یا سیت یا قنوطیت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک خلقی تباہی اور INGRAINED فنا پریری کا اندیشہ ضرور ذہن میں رکھتے ہیں لیکن رجائیت، امید اور اپنے حصے کی روشنی کو ظہور میں لے آنے کا اطمینان پیرزادہ کی شاعری کا ایک نہایت لطیف، نفیس اور دلکش رُخ ہے۔ وہ جلنے اور روشنی پھیلانے اور پھر جلنے کے ایک مسلسل عمل کو چراغ اور دیے کے استعاروں میں بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک نوع کی متھ آف سسی فس (MYTH OF SISYPHUS) ہے جس میں قانونِ باغبانی صحرا لکھنے کے کرب کے ساتھ ساتھ کارے کر دم کی سرخوشی بھی شامل ہے۔

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا، ایک دیا بجھا ہوا

سب مری روشنی جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

صرف ہو جانا یا CONSUME ہو جانا تو ہر مظہر کائنات کا مقصوم ہے لیکن اُس عمل کے نتیجے میں روشنی، نیکی، خیر اور انسان دوستی کی روایت کا حصہ بن جانا ایک ایسا آدرش ہے جس کے بغیر شاعری کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اطالوی شاعر یو جینیو مانتیل نے کس قدر بلیغ انداز میں اس سمت اشارہ کیا ہے:-

BUT AN AUTOBIOGRAPHY CAN ONLY SURVIVE IN ASHES

اور یہیں مجھے پیرزادہ قاسم کا یہ شعر بھی یاد آ رہا ہے۔

شعلہ بجاں عشق کا کیا یہی انجام ہے
آگ بجھا دی گئی، راکھ بچا لی گئی

پیرزادہ کے اشعار میں جلنے بجھنے اور روشنی و تیرگی اور راکھ کے ان تلامذات سے جب میں گزرتا ہوں تو MONTALE کے یہ مصرعے بھی میرے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں:-

I AM NO MORE

THAN A SPARK FROM A BEACON, WELL DO I KNOW IT :

TO BURN THIS, NOTHING ELSE, IS MY MEANING.

”تند ہوا کے جتن میں“ پیرزادہ قاسم نے زندگی کے تضادات کو یکجا کر کے اُس معنویت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جو تہہ در تہہ تقابلوں میں گم کر دی جاتی ہے۔ پیرزادہ نے ذات کے دروں خانے میں بھی اس معنویت کو ڈھونڈا ہے اور شعورِ عصر، وطن کی مٹی اور تہذیب کے عالمی تناظر میں بھی اس کے خدو خال تلاش کیے ہیں۔ وہ اپنی تمام ترکیفیات کے اظہار کے لیے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں جس میں ابلاغ کی ہر شرط پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ براہ راست اظہار میں اس بالواسطہ طرز کو بھی برقرار رکھتے ہیں جس میں حقیقت نگاری اور شاعری ایک ہو جاتے ہیں۔ اس اسلوب کی چند مثالیں دیکھئے :-

بہت سی اور بھی شرطیں ہیں کارواں کے لیے
ہجوم سے تو کبھی کارواں بسنا ہی نہیں

جس انقلاب کی سرخی مرے لہو نے لکھی
وہ انقلاب مری داستان بنا ہی نہیں

کرب نہاں کو کچھ ہی حرفِ سخن بنا سکے
ورنہ یہ شور بے صدا کس کی سمجھ میں آسکے

اب رہ درسم دوستی بس یہی ہو کے رہ گئی
کوئی فریب دے سکے، کوئی فریب کھا سکے

کوئی نہیں سفر کی شرط، جو بھی چلے چلے مگر
درد سے تیز اٹھ سکے، جان سے تیز جا سکے

میں نے تو ہر ذرہ صحرا میں اک دل رکھ دیا
اب بہارِ جاوداں آئے یہاں بیوند ہو

مری نظر نے یہ انداز بے یقینی کا
فریبِ عہد بہاراں کے بعد سیکھا ہے

پیرزادہ قاسم کے اس شعری مجموعے میں ایسے اثر انگیز اور دلکش اشعار کی کمی نہیں۔ وہ ادبی

روایت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قبولیت عام کے زاویوں کو بھی کلام میں شامل رکھتے ہیں کیوں کہ وہ ہمیشہ سے مشاعرے کے بھی ایک کامیاب اور ہر دلعزیز شاعر رہے ہیں اور ان کی یہی ہر دلعزیزی انہیں اُردو دُنیا کے ان شائقینِ شعر و ادب کی محفلوں تک بھی لے جاتی ہے جو شرقِ اوسط کے رنگزاروں سے لے کر نئی دُنیا کے برف زاروں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آج کے ابلاغیاتی تقاضے بھی یہی ہیں کہ فن زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک وسیع تر تناظر میں کیا جاسکے۔ پیرزادہ قاسم اس مرحلے سے گزر رہے ہیں اور ان کے کلام کی خاطر خواہ پذیرائی ہو رہی ہے۔

”تند ہوا کے حبش میں“ غزلوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت نظموں کی کتاب بھی ہے۔ اس میں صرف ہیئتوں کا فرق ہی نہیں ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیرزادہ جب بارود، میزائل اور دھماکے جیسے الفاظ اور لفظی تصاویر سے اپنی غزل کے امکان کو وسعت دیتے ہیں تو بھی کچھ کیفیات ”تنگنائے غزل“ سے نکلنے پر اُکسلے لگتی ہیں۔ نظمیں خصوصی مطالعہ اور توجہ چاہتی ہیں۔ ان میں مروجہ بحر و آہنگ سے بھی کام لیا گیا ہے اور نثری نظم کی تکنیک بھی استعمال کی گئی ہے۔ ”ملاقات“، ”بے بسی“، ”موسمِ مرے دل کے“، ”یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے“، ”کل جو آنے والا ہے“، ”آرزو کی انتہا“، پیرزادہ کی چند خوبصورت اور دل پر اثر کرنے والی نظمیں ہیں۔

: ”آرزو کی انتہا“ دیکھیے :

ٹہرے ہوئے پانی میں
یوں دُور بیٹھ کر
کنکر نہ پھینکو
اس بلچل سے کیا حاصل
قریب آؤ اور آخری بار
آئینہ آب پر
اپنے حسیں خدو خال ثبت کرو
سو کھتے تالاب کو اس سے زیادہ کی آرزو بھی نہیں

ایک اور نظم کا ایک بند ہے :

میرے دل کے آنگن میں بھی
یہ جانے پہچانے موسم
آتے اور جاتے رہتے ہیں
لیکن یہ اک بات عجب ہے
کشتِ دل میں جتنی قسموں کے بھی پھول کھلا کرتے ہیں

سارے سُرخ ہوا کرتے ہیں
 اور پت جھڑ میں یخ بستہ بے مہر ہوا
 جب رقص زمناں کا آغاز کیا کرتی ہے
 شاخوں سے گرنے والے پتے بھی
 سبتر ہوا کرتے ہیں (موسم میرے دل کے)
 ایک مختصر نظم "تسل" یوں ہے :-

میری آتش فکر اور شعلہ نوائی
 بے حس سماعتوں سے مکالمہ کرتے کرتے
 تھک گئی تو پھر
 راکھ کے لہجے میں گفتگو کرنے لگی
 پیرزادہ قاسم تند ہوا کے حشر میں "شریک ہو کر" راکھ کے لہجے میں گفتگو کرنے کا ہنر جانتے ہیں
 میرے نزدیک کسی بھی شاعری کا اعتبار اور کسی بھی کتاب کا جواز اس ہنر کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ پیرزادہ
 قاسم کا تخلیقی شعور اس ہنر کے اول و آخر الفا اور امیگا کو پانے کی راہ طے کر رہا ہے۔ اس کی کچھ خوش آئند
 جھلکیاں ان کے اس پہلے شعری مجموعے میں موجود ہیں اور پیرزادہ قاسم اپنا یہ شعری مجموعہ "بے حس" اور "دافن"
 کی کشمکش کے درمیان اس عہد کے سپرد کر رہے ہیں۔
 کیا اسے بے حس کہوں اب جو نہ دافن ملے
 کرب تو سارے زلیست کے آج نوا کے ساتھ ہیں

بالمشافہ

میں نے اس دنیا میں جب پہلی بار آنکھیں کھولیں تو روشنی کی جگہ دھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی اور کان میں اذان کی آواز کے بعد دوسری جنگِ عظیم کی دم توڑتی آہٹیں اور ٹڈیال، زخم خوردہ انسانوں کی کراہیں در آئی تھیں۔ اسی پریشان حالی میں میں نے اپنے بزرگوں کو غلامی اور استبداد کے خلاف اپنی دیرینہ جنگ کا آخری فیصلہ کن مرحلہ طے کرتے دیکھا۔ ہماری سرزمین نے آزادی کا سانس لیا مگر اس کو کیا کیجئے کہ غیروں سے آزادی کی جنگ تو ہم نے جیت لی مگر اپنوں سے جمہوریت کی جنگ ہارتے رہے اور فکری و قومی یکجہتی کو لخت لخت ہوتے دیکھتے رہے۔ آزادی کے بعد کی داستان جو میں نے چند جملوں میں بیان کر دی ہے کم و بیش بیابیس کربناک اور بے سکون برسوں کی زندگی ہے جس میں خوشگوار یادوں کے نام پر صرف آرزو اور انتظار کی کیفیتیں شامل ہیں۔ اپنے شعور کی منزلوں کا سفر میں نے انہی فضاؤں میں شروع کیا —

اعلیٰ اقدار اور روایتوں کی پامالی، عدم اعتماد اور بے یقینی کی انہی فضاؤں میں میری شاعری پروان چڑھی ہے۔ ان حالات میں میں نے اپنے ذاتی جذبات کی دھیمی دھیمی روشنی میں جھلکانے کی بجائے اپنے لہو سے چراغ روشن کرنے کا ہنر سیکھا تاکہ روشنی بطونِ ذات سے باہر زیادہ با مصرف اور بامعنی بن سکے۔ سوتند ہوا کے جن میں ”آپ کو یہی چراغ جلتے بجھتے نظر آئیں گے اور آپ روشنی جاں کو حرفِ سخن میں ڈھلتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔“

روشنی جاں کو حرفِ سخن بنانے کا عمل میرے یہاں غیر فطری طور پر نہیں در آیا بلکہ اس کے محرکات میں میرے گھر کی ادبی و علمی فضا اور میرے گھرانے کی ادبی، سماجی، سیاسی اور دینی روایتیں شامل ہیں۔ میں نے ان ہی علمی فضاؤں اور روایتوں سے استفادہ کیا ہے۔ کبھی بالمشافہ اور کبھی غائبانہ۔ میں یہاں پر نہ اپنا شجرہ نسب پیش کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی خاندان کے بزرگوں اور اہل علم و دانش کی کوئی طویل فہرست۔ گفتگو کے طور پر اگر چند اشارے کرنا چاہوں تو ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی، حافظ ابراہیم، نہال سیوہاروی، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ میرے دادا منشی ریاض الدین بسمل (مرحوم) صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ وہ تحصیلداری سے سبک دوش ہو کر اپنے آبائی گھر حبیب والہ آ گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کی بیٹھک میں ہر شام ادبی محفل

منعقد ہوتی تھی اور ان کی سپینش کا بڑا حصہ اردو رسائل و جرائد کی خریداری میں صرف ہو جاتا۔ میرے والد مرحوم کی زندگی کا بڑا حصہ بھی صحافیانہ گزرا اور اسی حوالے سے پرانی دہلی کے ہمارے چھوٹے سے مکان میں جہاں ۱۹۴۳ء میں میں پیدا ہوا کتابوں اور جرائد کے علاوہ کم ہی کسی اور چیز کی گنجائش نظر آتی تھی۔ میرے والد بھی شعر کہتے تھے اور مجھے اپنی والدہ کی ملی نظموں کے بھی کچھ بند ابھی تک یاد ہیں۔ آہنگِ نغمہ کا اولین شعور مجھے انہی کی آواز سے ملا اور طبیعت میں نغمگی اسی لمحہ مادر کی بازگشت بن گئی، لیکن یہ سب شخصیات اور یہ ساری علمی و ادبی روایتیں میری بیساکھیاں نہیں بنیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب میں بیساکھیوں کی مدد سے بہت دُور تک نہیں چلا جاسکتا۔ اپنے قدم خود ہی جانے پڑتے ہیں، سو میں نے بھی بُرا بھلا چلنا سیکھ ہی لیا۔ اس سلسلے میں میرا دل اپنے بزرگوں کے لئے تشکر اور احسانمندی کے جذبات سے ہمیشہ معمور رہا ہے۔

لیکن ان سب سے الگ تربیت ذات کے حوالے سے میرے لیے میرے گھرانے کی جو روایت سب سے زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے وہ ہے تصوف، اس کی تعلیم اور فلسفہ۔ انسان دوستی اور دردمندی کی دولت بیدار مجھے اسی جوار سے ملی اور اطمینانِ قلب کی لذت سے دل یہیں واقف ہوا۔ یہ اعلیٰ اقدار ہماری زندگی کے لئے جس قدر اہم ہو سکتی ہیں اس کا اندازہ سب کو ہے لیکن یہ میرا یقین ہے کہ شاعری کے لیے تو یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انسان دوستی اور دردمندی کے بغیر حقیقی زندگی سے آشنائی ممکن ہی نہیں۔ ایسے میں اظہار کی سچائی عنقا ہو کر رہ جاتی ہے۔

شاعری میری پہلی محبت ہے اور میں اس سلسلے میں ہمیشہ سے سنجیدہ رہا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیس/پچیس سال کا یہ شعری سفر کم از کم بے سمت اور بے مقصد نظر نہیں آتا۔ اس محبت کے سلسلے میں میری ذات کے مسائل اتنے گھمبیر نہیں رہے جتنے میرے فرائض منصبی۔ سائنس کے ایک کل وقتی طالب علم کی حیثیت سے، ایک اسناد و محقق کی حیثیت سے مجھے اس محاذ پر بھی بڑی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یوں شاعری کو اتنا وقت نہیں دے پایا کہ اس کا حق ادا ہو سکتا، مگر پھر بھی بے وفائی کا الزام میں نے اپنے سر نہیں آنے دیا۔ سائنس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تخلیقی عمل کے لئے جو حقیقت پسندانہ فکر (REALISTIC THINKING) ضروری ہے اس پر ایسی جلا ہوئی کہ دُنیا آئینہ خانہ معلوم ہونے لگی اور تخیلی فکر (IMAGINATIVE THINKING) کے بہت سے نمایاں گوشے بھی گرفت میں آتے گئے۔

شاعری کے بارے میں میرے خیالات کسی الجھن کا شکار نہیں۔ شاعری آج بھی ایک بیش بہا وسیلہ اظہار ہے اور غیر متمدن دور میں بھی یہ انسان کا وسیلہ اظہار رہی ہے۔ قدیم ترین تاریخ میں حضرت آدمؑ کے اشعار کا ذکر ملتا ہے جو انہوں نے ہابیل کی موت پر کہے تھے۔ جذبات و کیفیات کے اظہار کا یہ ذریعہ بہت قدیم اور بہت موثر مانا جاتا رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پرانے زمانے میں شاعری یا تخلیقی عمل کے متعلق ہم آنا نہیں جانتے تھے جتنا آج واقف ہیں۔ آج شاعری اپنا وسیع پیش منظر اور پس منظر رکھتی ہے۔ میرا

یقین ہے کہ آج کی شاعری انسانی زندگی کی تصویر ہی نہیں تفسیر بھی ہے۔ اسی لئے صرف صنعت گری اور فن و حرفت ہی شاعری کا کل جوہر قرار نہیں دیے جاسکتے۔ زندگی کی تفسیر کے لیے شاعری اعلیٰ ترین سچائی اور بلند خیالی کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی اعلیٰ ترین سچائی اور بلند خیالی کی وجہ سے ہی ارسطو شاعری کو تاریخ نویسی پر فوقیت دیتا ہے۔

میرے نزدیک شاعر یا تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ زودحسی (EMOTIONAL HYPER

SENSITIVITY) اور بیش حسی (SUBLIMATED SENSITIVITY) کا مزاج رکھتا ہو اور بیدار خیالی (CONSCIOUSNESS) اور باضمیری (CONSCIENTIOUSNESS) کے جوہر سے مالا مال ہو۔ بیدار خیالی کے بغیر شاعر کا رشتہ، معاشرے، ماحول اور اطراف و جوانب سے قائم اور برقرار نہیں رہ سکتا اور وہ عمل و رد عمل کے حقائق سے بے خبر اور بلند سنجیدہ خیالی سے دُور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح باضمیری کے بغیر شاعر سے اس اعلیٰ ترین سچائی کی توقع نہیں کی جاسکتی جس کی جانب ارسطو نے اشارہ کیا ہے۔ ان سارے عوامل کے ہوتے ہوئے جو کچھ تخلیق ہوتا ہے وہی شاید اعلیٰ شاعری کے ذیل میں آ سکے۔ بقول میتھیو آرنالڈ (MATTHEW ARNOLD) اعلیٰ ترین شاعری کے نمونوں میں تخلیقی جوہر، اثر انگیزی اور نشاط فکری کی ایسی نمود ملتی ہے جس کا بدل کسی ادو طرز بیان میں ممکن نہیں۔ ایسی اعلیٰ شاعری کا خالق ایک بلند مرتبت اور سچا تخلیق کار ہی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا فنکار جو رسکن (JOHN RUSKIN) کو سیال فکری و ہوشمندی، تخیل اور فنی مشقت کی تجسیم نظر آتا ہے۔ ذرا غور کیجیے تو اس تجسیم میں آپ کو میر صاحب کا چہرہ بھی ملے گا اور غالب کا پیکر بھی اور یہیں اقبال کی فغانِ نیم شب کا آہنگ بھی آپ سن سکیں گے۔

میرے خیال و فکر کی گزر گاہیں جب ایسے عظیم تخلیق کاروں کے بابرکت قدوم سے سرفراز ہوتی ہیں تو ان ہی کی خاکِ پا کے طفیل میں اپنے آپ کو با تو قیر جانتا ہوں اور انہی کے خانوادہٴ شعر سے اپنی وابستگی کو اپنی تمام کمر متقامی کے باوجود باعثِ عزت و افتخار تصور کرتا ہوں۔ میں ان سے ملتا جلتا بھی ہوں اور مختلف بھی۔ میرے دکھ اور میری خوشیاں اساسی طور پر میر و غالب جیسی ہی ہیں لیکن میرا زمانہ اور میرے مسائل مختلف ہیں۔ آج ذہنی اور فکری کرب کے محرکات وہ نہیں جو میر و غالب کے تھے۔ آج کے دکھ ہمہ گیری میں زیادہ اور وسیع ہیں۔ ان کی گرفت زیادہ مضبوط اور ان کی فضا زیادہ جبروتی ہے۔ آج جس بے یقینی اور عدم اعتماد کی فضا میں میرے ہم عصر اور میں سانس لے رہے ہیں اس کی گھٹن ہی کچھ اور ہے۔ معاشرے میں ہر شخص سفاکی کی حد تک خود نگہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اور زندگی کی اعلیٰ اقدار دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ غالب کو ڈر رہتا تھا کہ درپردستک کہیں ادائے قرض کا تقاضا نہ ہو۔ آج دروازے کی گھنٹی کسی اسلحہ بردار کی آمد کا اعلان بھی ہو سکتی ہے اور ذرا سی دیر میں ایک سفاکانہ قتل کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔ آج غالبِ پاکی میں سوار ہوتے تو ہماری مڑکوں سے اس بُبک رفتاری سے نہ گزر پاتے اور سلامت ردی

کا تصور پاش پاش ہو کر رہ جاتا۔ میر صاحب نحاس سے گزرتے ہوتے اور کسی سمت سے کوئی گولی ان کے کسی بے گناہ دوست کا لہو چاٹ جاتی تو شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھتے۔ ہیروشیا اور ناگاساکی کا واقعہ اگر غالب کے زمانے میں پیش آیا ہوتا تو شاید مرزا پریشانی کے عالم میں خودکشی کر لیتے آج اگر (SATELITE) کے ذریعے اولمپک شمع روشن کی جاسکتی ہے تو اس سے انسانی آبادیوں کو نیست و نابود بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا دکھ یہ ہے کہ نہ تو ہمیں حواس ہی کھونے ہیں اور نہ ہی خودکشی کرنا ہے۔ ہمیں انہی حالات میں زندہ رہنا ہے، آواز بھی اٹھانی ہے اور احتجاج بھی کرنا ہے۔

ان حالات میں آج کی شاعری زمان و مکان کی قیود سے کس طرح آزاد رہ سکتی ہے! ایک مدت تک میں بھی اسی لازمانی اور لامکانی کو شاعری کا اہم ترین عنصر جانتا رہا، لیکن آج میں سمجھنے کی طرح سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر اور لمحہ موجود کے حوالے کے بغیر کوئی شعری رویہ مکمل سچائی کا علمبردار نہیں ہو سکتا۔

ہمارا آج کا معاشرہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے قوانین اور ہماری اپنی ایجاد کردہ بے قانونیوں کی آماجگاہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے قوانین جزا و سزا کے نگہدار ہیں کسی معاشرتی برائی یا بے انصافی کے خلاف تھانوں میں "ایف آئی آر" درج کرائی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر کسی کو اپنی پریشاں خیالیوں کی معاشرتی بے حسی کی تاراج ہوتی روایتوں کی، ٹوٹتے انسانی رشتوں کی، معاشرتی ناہمواریوں اور ناآسودگی کی "ایف آئی آر" درج کرانی ہو تو وہ کہاں جائے۔ اس کے لیے کوئی دفتر نہیں لیکن آپ یقین کیجیے کہ یہ "ایف آئی آر" بھی درج ہوتی ہے۔ کسی تھلنے میں نہیں، شاعر کی بیاض شعر میں۔ اسی لیے یہ بیاض شعر آنے والے زمانے کے لیے ایک قیمتی دستاویز بن جاتی ہے۔ ہم غالب کے زمانے کو تاریخ سے زیادہ ان کے اشعار میں واضح پاتے ہیں۔ غالب کی بات اپنی جگہ مگر آج کے دور میں جو کچھ ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر ہو رہا ہے اس کی بہت جامع تفسیر آج کی شاعری میں لکھی جا رہی ہے اور میرے بہت سے پیشرو اور ہم عصر نہایت سچائی اور دیانت داری سے آج کی شاعری کے تقاضے پورے کر رہے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔ میں بھی نیاز مند ان کے ساتھ ساتھ ہوں۔

ان سچ بولنے والوں میں سے کئی کے لہجے جوش جذبات سے کرخت اور بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہاں شاعری کو نعرہ بازی نہ بننے دینا بڑا مشکل کام ہے کیونکہ شاعری میں اس کرختگی کی سمائی کسی حد تک ہی ممکن ہے۔ صرف اردو شاعری ہی میں کیا مغربی شاعری میں بھی ایسی آزمائشیں رہی ہیں۔ DAYLAN THOMAS کی یہ

لائسنس :-

RAGE, RAGE AGAINST THE DYING OF LIGHT
DO NOT GO GENTLE INTO THE GOOD NIGHT

یا ROY FULLER کا یہ بند :

ANYONE HAPPY IN THIS AGE OF PLACE
IS DAFT OR CORRUPT. BETTER TO ABDICATE
FROM A MATERIAL OR SPIRITUAL TERRAIN
FIT ONLY FOR BARBARIANS

اسی تلخ گوئی کی مثالیں ہیں۔ لیکن میں شائستہ لب و لہجے اور نرم گفتاری کو فوقیت دیتا ہوں کیوں کہ یہی کسی بھی دانش ورانہ (INTELLECTUAL) رویے کی اساس ہے۔ میری سینتالیس سالہ عمر ہو یا پچیس سالہ شاعری میں نے کہیں بھی اور کسی قیمت پر بھی انہیں سچائی، شائستگی اور دردمندی کے دائرے سے باہر ایک قدم بھی رکھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس ریاضت نے میری شاعر طبعی کی تربیت کچھ یوں کر دی ہے کہ خواہ خواب خرابی ہی کیونٹ ہو نہ قدم بے استواری کا شکار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی فکر۔ اس کیفیت سے گزرتے ہوئے مجھے عدم اطمینان کا احساس نہیں ہوتا۔ جیسا کچھ بھی ہے میں اس میں خوش ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت میں کئی برسوں کی غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے جس کا ذمہ دار صرف اور صرف میں ہی ہوں۔ اس تمام عرصے میں میری شاعری سے دلچسپی رکھنے والے اور میرے محبتی بار بار کتاب کی اشاعت کے بارے میں مجھے یاد دلاتے رہے۔ سلیم بھائی (جناب سلیم احمد) اور بھائی رئیس امر دہوی کی یاد دہانیاں اب یاد آتی ہیں تو دل خون ہو جاتا ہے۔ خدا انہیں غرق رحمت کرے۔ آج میں اپنی یہ کتاب غائبانہ طور پر ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

میرے بہت ہی مکرم و معظّم جناب احمد ندیم قاسمی ہیں۔ میں ان کی محبت کا معترف ہوں۔ وہ جب حب ملے ہیں کلام کی اشاعت کے بارے میں بہت ہی پیار سے استفسار کرتے رہے ہیں۔ میرے محترمین میں جناب تابش دہلوی، جناب محشر بدایونی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، جناب راغب مراد آبادی اور بھائی حنیف اسعدی نے بار بار ”کتاب پُرسی“ کی ہے۔ جناب نظیر صدیقی نے کئی بار کہا کہ کم از کم کچھ کلام جمع کر کے انہیں بھیجا دوں تاکہ وہ اپنے موڈ کے مطابق قدرے فرصت سے اس پر تفصیلی نگاہ ڈال سکیں۔ بھائی عالم تاب تشنہ اور عزیز سلیم کوثر کی یاد دہانی مطالبے کی شکل اختیار کر گئی اور بھائی جون (جون ایلیا) جو اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں مجھ سے کہیں زیادہ بے اعتنائی کے مجرم کہے جاسکتے ہیں، نے بہت ہی پیار سے تقاضا کیا عزیزہ پروین شاکر نے نہ صرف بار بار کتاب کی جانب میری توجہ مبذول کرائی بلکہ پبلشر کے انتخاب و انتظام کی تمام تر ذمہ داری بھی خود ہی اٹھانے کی پُر خلوص پیشکش کی۔ میری بے اعتنائیوں کو محبتوں کی اسی یلغار نے پسا کیا اور یوں اب یہ کتاب ”تند ہوا کے جشن میں“ شائع ہو رہی ہے سو یہ کیسے ممکن ہے کہ کتاب کی اشاعت کے موقع پر مرادل ان تمام بزرگوں اور دوستوں کے لیے جذبہ سپاس سے لبریز نہ ہو۔ میں تشکر اور سرشاری کی ٹلی جلی کیفیات کے درمیان ان سب کی خدمت میں اپنی کتاب ”تند ہوا کے جشن میں“ پیش کرتا ہوں۔

استاد محترم ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور برادر مکرم جناب سحر انصاری نے اس کتاب کے سلسلے میں تمام مراحل پر بے حد ہمت افزائی فرمائی اور کتاب کے بارے میں مضامین بھی لکھے۔ میرے عزیز دوست جناب جاذب قریشی بھی مشاورت میں شامل رہے۔ میں ان سب کی محبتوں کا معترف بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔ خاص طور پر محترم عزیز حامد مدنی کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے جدید اردو شاعری پر اپنی تازہ اور انتہائی اہم کتاب کے

آخری مراحل کی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکالا اور اس مجموعہ کلام پر نگاہ ڈالی۔ ان کا یہ حسن عمل میرے لیے بے پناہ ہمت افزائی کا حامل ہے۔ مجروح بھائی (جناب مجروح سلطان پوری) اس کتاب کی اشاعت کا سن کر بہت خوش ہوئے اور لکھ کر اس کا اظہار بھی کیا۔ پہلے بھی اور اب بھی۔ کیفی بھائی (جناب کیفی اعظمی) نے ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور عمری جناب اختر الایمان کا رویہ بہت مشفقانہ اور ہمت افزا رہا اور انہوں نے اپنے مصروف شب و روز میں سے کچھ لمحے پس انداز کیے تاکہ ”تندہوا کے جشن“ میں ”میرے ساتھ شریک ہو سکیں۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب سے ۱۹۸۴ء میں سرسری سی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ”فیض خطبات“ کے سلسلے میں کراچی تشریف لائے تھے۔ دہلی واپسی پر ہفت روزہ ”نئی دنیا“ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا کالم میرے دو اشعار کے حوالے سے لکھا اور میرے ایک شعر کو کالم کا سرنامہ بھی بنایا۔ میں ان کا بھی تہ دل سے ممنون احسان ہوں۔

اُردو دنیا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان سے باہر ادبی محفلوں اور مشاعروں کے حوالے سے ایک وسیع جہاں آباد ہے۔ مجھے بار بار ان محفلوں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ صرف مشاعروں کے سلسلے میں ہی دنیا کے کم از کم ایک درجن سے زیادہ ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا اور اُردو زبان و ادب سے محبت کرنے والے دوستوں کے ایک بہت بڑے حلقے سے شناسائی ہوئی جواب محبت و یگانگت کے اوٹ رشتے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ سب میرے بہت ہی پر محبت سامع اور قاری ہیں اور نہ جانے کب سے اس مجموعہ کلام کے منتظر۔ ان میں برادر گرامی قدر جناب علی صدیقی بھی ہیں۔ برادر م سلیم جعفری بھی ہیں۔ بھائی منصور جاوید بھی ہیں اور میری مدوح بہت ہی علم دوست ڈاکٹر اختر جہاں ملک بھی۔ ڈاکٹر اختر جہاں نے تو اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں عملاً بہت دلچسپی لی اور معاونت کی جس کے لیے میں خصوصی طور پر ان کا ممنون کرم ہوں۔ ان تمام دوستوں کی بے پناہ محبتوں کے جواب میں میرے تہی دامن میں صرف خلوص بے پایاں ہے اور اپنی پریشاں خیالیوں کی یہ ڈائری ”تندہوا کے جشن“ میں جو میں ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس کتاب کی صورت گری میں اسحاق شاہد کا بہت ہاتھ ہے۔ کتابت، ترمیم و آرائش انہی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی داد آپ بھی انہیں دیجیے۔ سرورق کے سلسلے میں نشری نظم کی معروف شاعرہ ثروت سلطانہ مجھ سے بھی بڑھ کر فکر مند رہیں اور میرے بھتیجے عزیز پیروزادہ سرور رضا بھی سرگرم رہے۔ بہر حال سرورق جو کتاب سے آشنائی میں تعارفِ اول ہوتا ہے میرے بہت ہی پیارے دوست اقبال مہدی کی تخلیقی تاب و توان کا اظہار ہے۔ یہ درویش صفت تخلیق کار لظاہر خاموش لیکن اپنے دامنِ فکر میں خدو خالِ رنگ و نور کی عجب دُنیا سمیٹے بیٹھا ہے۔ دوستوں میں سید امروہوی، ذہین عالم خاں اور ابوالحسنات نے پریس اور متعلقہ سارے کام سنبھالے رکھے اور مجھے ان مشقتوں سے بچائے رکھا۔

خاص طور پر بردرم ابوالحسنات نے اس قدر محنت کی کہ اب یہ کتاب ان کی بھی کہی جاسکتی ہے۔ میں ان تمام حضرات کے لیے دُعا گو ہوں۔

زندگی کی ہنگامہ خیزوں نے اپنی ایک ر و اور اپنا ایک راستہ متعین کر لیا ہے۔ سو میں اسی راستے سے ہوتا ہوا ہر شام گھر آجاتا ہوں۔ یہ ایک الگ دُنیا ہے جہاں کی بے اطمینانیوں میں سکون، بے قرار یوں میں قرار اور ہنگاموں میں عافیت ہے۔ یہ عملداری راشدہ کی ہے جو ہمیشہ میرے اور ان بے اطمینانیوں، بے قرار یوں اور ہنگاموں کے درمیان ایک خطِ تحفظ کی حیثیت سے قائم رہی اور جس نے مجھے بے شمار ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا۔ اس طرح پس انداز کیے گئے لمحات میری شاعری کے کام آئے مگر اس کی قیمت راشدہ اپنی اضافی اور تھکادینے والی ذمہ داریوں کی شکل میں ادا کرتی رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتراف میں تشکر کی ساری کیفیات سمٹ آئی ہیں۔

اس کتاب میں میری کل شاعری نہیں۔ گزشتہ دس / پندرہ برسوں میں کہی گئی غزلوں کے ساتھ کچھ پرانی غزلیں جو لوگوں کو یاد رہیں اور جن کے لیے احباب کا اصرار تھا کہ ضرور شریک کی جائیں، شامل کر دی گئی ہیں۔ مثلاً مجموعے کی آخری غزل ۲۵ سال پرانی ہے۔ نظموں کے انتخاب میں کوئی خاص طرز یا غایت پیش نظر نہیں رہی۔ یہ ایک بے ساختہ سا انتخاب ہے جس میں آزاد اور کچھ نثری نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔

مشہور اطالوی شاعر ARIOSTO نے اپنی طویل جیتی جاگتی نظم ORLANDO FURIOSO اپنی زندگی کے سٹائس برسوں میں مکمل کی تھی۔ میں اس کی ہمت و استقامت کی داد دیتا ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ اگر زندگی کی سچائی کو سمیٹتے ہوئے سٹائس بے لاگ مصرعے ہی لکھنا ہوں تو زندگی بھر کی مہلت بھی کم لگتی ہے۔ کچھ بے مہلت ماہ و سال میرے حصے میں بھی آئے ہیں اور یہ سارا عرصہ بھی ”تند ہوا کے جشن میں“ چراغ جلانے اور روشن رکھنے کی تنگ و دو میں گزر گیا۔ میری شاعری اسی جدوجہد کی نامکمل داستان ہے۔ یہ داستان کیسے اور کب مکمل ہوگی مجھے معلوم نہیں۔ تند ہوا کا یہ جشن ٹہرے تو شاید پتہ چل سکے کہ اگلا باب بادبہاری اور رنگ و نگہت کی کہانی ہے یا بے رداسروں، بے لباس جسموں، ٹوٹے پڑے، بکھرے پتوں، کھلائے پھولوں بے چراغ گھروں اور حیران و آزرده مکینوں کی داستان۔

و اِس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جاتے
ہم حلقِ بریدہ سے ہی تفسیر کریں گے

میر

بے کراں اک تیسرگی کو روشنی بخشی گئی
خاک کو تاشیر دی اور زندگی بخشی گئی

اُس نے اپنے ذوق کی تسکین چاہی اور پھر
کائناتِ زیست کو صورت نئی بخشی گئی

سائے انسان پیکروں میں پھونک دی روح حیات
ایک جوہر ایسا رکھتا آگہی بخشی گئی

سب صفاتی، نفسیاتی ضابطے طے پا گئے
کچھ عطاے غم ہوئی اور کچھ خوشی بخشی گئی

اشرف المخلوق ہونے کا شرف بخشا گیا
فکر کو جو لائیاں دیں، شاعری بخشی گئی

بے زبانی کو زباں بھی دی گئی بہرِ سپاس
اور توفیقِ سخن کو حمد بھی بخشی گئی



عیاں سُخن میں دہی فکر میں نہاں بھی دہی
ہوں بیقرار تو وجہ تدارِ جاں بھی دہی
اُنہی کی یاد سہارا ہے پاشکستوں کا
ہیں راہِ زلیست میں پُرسنِ خشتِ گاہ بھی دہی

وہ اپنی ذات میں تفسیرِ حکمِ باری ہیں
 ندائے شب بھی وہی صبح کی ازاں بھی وہی

وہ دشمنوں کو بھی اپنے نوازتے ہیں مگر
 عُدوِ حق کے لئے خنجر و سناں بھی وہی

ستم کی دھوپ نے سب کچھ جلا دیا ہوتا
 ہیں کشتِ زلیبت پر رحمت کا سائبان بھی وہی

وہی تو اصل میں مقصودِ کارِ رواں ہیں مگر
 عجیب بات کہ ہیں میسرِ کارِ رواں بھی وہی

خون سے جب جلا دیا ایک دیا جُھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا جُھا ہوا

اپنے تو عہدِ شوق کے مرحلے سب عجیب تھے
ہم کو وصال سا لگا ایک دیا جُھا ہوا

ایک ہی داستانِ شبِ ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا، ایک دیا جُھا ہوا

مُحَلِّ رنگ و نور کی پھر مجھے یاد آگئی
پھر مجھے یاد آگیا ایک دیا بجھا ہوا

مجھ کو نشاط سے فزوں رسم و فاعزیز ہے
میرا رفیقِ شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

شعلہ ہوا نژاد تھا پھر بھی ہوا کے ہاتھ نے
بس یہی فیصلہ لکھا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

سب مری روشنی جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

ایک سے سلسلے ہیں سب، سحر کی رُت بتا گئی
پھر وہی صبح آئے گی پھر وہی شام آگئی

میرے لہو میں جل اُٹھے اُتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا بھٹنے دیے بُجھا گئی

میں بھی بہ پاسِ دوستاں اپنے خلاف ہو گیا
اب یہی رسمِ دوستی مجھ کو بھی راس آگئی

تُنہوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے مگر
تن سے کوئی قبا چھنی سر سے کوئی ردا گئی

تازہ بڑیدہ شاخِ گل تجھ کو تو ہوش ہی نہیں
دیکھ ترے قریب سے رقصِ کُناں صبا گئی

دل زدگاں کے قافلے دُور نکل چکے تمام
اُن کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

زنگ نہیں اہو سہی رونقِ فصلِ جاں تو ہے
گل نہ سہی مگر بہارِ زخم تو کچھ کھلا گئی

آخرِ شب کی داستاں اور کریں بھی کیا بیاں
ایک ہی آہِ سر دھتی سارے دیے بجھا گئی

ہم سے نہ پوچھ جائے گی ہجر کی رگہز کہاں
شام ہوئی تو تھی کہیں صبح ہوئی مگر کہاں

دانہ و دام سے پرے میری اڑان یاد کر
مجھ کو تلاش کرنے دیکھ رکھے ہیں بال و پر کہاں

عشق حصارِ ذات سے دُور بہت نکل گیا
ایسے میں جبرِ وقت بھی ہوتا ہے کارگر کہاں

ایسا ہی اکٹ مقام تھا اور سفر کی ابتدا
چھوڑ گیا ہے پھر مجھے یہ مراہم سفر کہاں

خواب ہی خواب نیست بھی خواب ہی خواب نیست بھی
دیکھیے قصہ طویل ہوتا ہے مختصر کہاں

دلولہ ہائے شوق سب صرف مہاجرت ہوئے
اب سر منزل وفا ڈھونڈ رہے ہو گھر کہاں

چھوڑ کے کارواں شوق منزلِ غم پہ کر قیام
مثلِ غبارِ کارواں پھرتا ہے در بہ در کہاں

یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سرِ شام
جو زخمِ صبح ملا تھا وہ بھر گیا سرِ شام

ملے تھے ہم کہیں کارِ جہاں تھے میلے میں
اُسے بھی جلدی تھی اور میں بھی گھر گیا سرِ شام

یہ آج کس کو اچانک مرا خیال آیا
چراغِ راہ میں یہ کون دھر گیا سرِ شام

خیالِ یار کی فرصت بھی اب کسے ہے نصیب
یہ پھول صبح کھلا اور بکھر گیا سِرِ شام

تمامِ دن کی تھکن سے میں جُھڑ ہاتھا مگر
کسی کی یاد کا چہرہ نہ نکھر گیا سِرِ شام

شبِ فراق کا احوال یاد آ ہی گیا
پھر ایک تیر سا دل میں اُتر گیا سِرِ شام

یہ صبح و شام مرے اس قدر ہی میسے ہیں
کہ جی اٹھا ہوں سحر دم تو مر گیا سِرِ شام

یہاں تو اپنے چراغوں کی فکر ہے سب کو
دیا جلایا ہے سب نے دیے جلائے کون

یہاں تو لوگ انھی حیرتوں میں جیتے ہیں
کہ تیر کس پہ چلے اور زخم کھائے کون

یہاں تو جاگتی آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں
جو جاگتے ہوں انہیں خواب سے جگاٹے کون

”یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ملتی“
مگر یہ بے خبری کی خبر سناٹے کون

یہاں تو صبح سے پہلے ہی بزم برہم ہے
دیا بھجوادے کوئی پر دیا بھجھائے کون

سچے شعر کا کھلیاں اور بھرتا جاتا ہے
درد کی زمینوں میں غم کی فصل بونے سے

حادثاتِ پیہم کا یہ مآل ہے شاید
کچھ سکون ملتا ہے اب سکون کھونے سے

کس سُہرے یاروں نے داستاں رقم کر لی
میرے خُونِ دل میں ہی انگلیاں ڈبونے سے



کوئی ہے جو شکستِ ضبطِ غم ہونے نہیں دیتا
میں رونا چاہتا ہوں اور وہ رٹنے نہیں دیتا

سرِ آغازِ ہر شب اک نیا غم گھیر لیتا ہے
جو خود بھی جاگتا ہے اور مجھے سونے نہیں دیتا

نئے غمِ بخشا ہے دل کو بہلائے بھی جاتا ہے
غرض وہ اعتبارِ غم کبھی کھوئے نہیں دیتا

بہت جی چاہتا ہے خود کو اب رولیں سرِ مستی
کوئی ہے جو یہ رسمِ غم ادا ہونے نہیں دیتا

عجب اک شعلہ غم فصلِ اُفت پھونک دیتا ہے
نئی اک فصل پھر بوئیں مگر بونے نہیں دیتا

برائے دل نئے داغِ محبت پیش کرتا ہے
مگر وہ داغِ ہائے کہنہ بھی دھونے نہیں دیتا

میانِ کارِ فنِ لفظوں کی قسمت جاگ اٹھتی ہے
غزلِ تخلیق کرتا ہوں محبت جاگ اٹھتی ہے

بہت مسرور رہتا ہوں بہت چہرہ سجاتا ہوں
مگر آئینے میں اک اور صورت جاگ اٹھتی ہے

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں گوشے میں
مگر ہر بار دُنیسا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے

عجب انداز کی بیداد گر ہے بزمِ یاراں بھی
پسِ جو رجوا پھر سے محبت جاگ اٹھتی ہے

عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخنِ معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

عجب اک دور آتا ہے طلبِ کارانِ دُنیا پر
کہ جب انسان سو جاتا ہے وحشت جاگ اٹھتی ہے

محبتِ اِس طرح تو منقلب ہوتے نہ دیکھی تھی
ذرا بے اعتباری ہو تو نفرت جاگ اٹھتی ہے



کدورتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیاں

زمانہ میری داستاں پہ رو رہا ہے آج کیوں
یہی تو کل سنی گئی تھی قہقہوں کے درمیاں

کوئی تو ہو جو مجھ کو آئینہ صفت دکھائی دے
میں کھو چلا ہوں اجنبی سی صورتوں کے درمیاں

ہزار سست روہی چلا تو جا رہا ہوں میں
طویل راہِ عشق پر صعوبتوں کے درمیاں

شعورِ عصر ڈھونڈتا رہا ہے مجھ کو اور میں
مگن ہوں عہدِ رفتگاں کی عظمتوں کے درمیاں

یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے
اگر یو نہی جیسا کیے ضرورتوں کے درمیاں

ابھی شکست کیا کہ رزمِ آخری اک اور ہے
پکارتی ہے زندگی ہزیمتوں کے درمیاں

یہ اور بات ہے کہ نیزہ زماں پہ ہوں مگر
میں سر بلند آج بھی ہوں دشمنوں کے درمیاں

ضمیرِ سر میں کبھی نوائے درد میں کبھی
سخنِ سرِ اُتو میں بھی ہوں صداقتوں کے درمیاں

یہ احترامِ وقت تھا کہ میں خمیدہ سر ہوا
سوا یک نقشِ پا ہوں اب فضیلتوں کے درمیاں

قیامتیں گزر گئیں کسی کے انتظار میں
ہنوز منتظر ہوں میں قیامتوں کے درمیاں

اب آؤ ایل کے رشتہ تپاک ہی کو ڈھونڈ لیں
جو کھو گیا ہے باہمی رقابتوں کے درمیاں

ہزار بُردباریوں کے ساتھ جی رہے ہیں ہم
محال تھا یہ کارِ زیست و حشتوں کے درمیاں



نظر میں نیت نئی حیرانیاں لیے پھرے
سروں پہ روزِ نیا آسماں لیے پھرے

اب اس فضا کی کثافت میں کیوں اضافہ ہو
غبارِ دل ہے سودل میں نہاں لیے پھرے

یہی بچا ہے سوابِ زلیت کی گواہی میں
یہی نشانِ دلِ بے نشاں لیے پھرے

قرارِ جاں تو سرِ کُوءے یارِ چھوڑ آئے
متاعِ زلیت ہے لیکن کہاں لیے پھرے

عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر میں
کسی کا ذہن کسی کی زباں لیے پھرے



وہ فرصتیں گئے دنوں کی یاد کیا دلائیے
زمانہ تیز رہا ہے اب شکست مان جائیے

نئی سی دلفریبیوں کی آرزو تھی زندگی
مآلِ کاراک نیا فریب ہے سو کھائیے

وہ آہستانِ یار تو گئے دنوں کی بات ہے
یہ شاہراہِ وقت ہے سو بوری اٹھائیے

تبسم ایک زیر لب بھی ہم پہ بار ہے مگر
ہمی سے لوگ کہہ رہے ہیں کھل کے مسکرائیے

صبا کی نرم آہٹیں سی آرہی ہیں کان میں
قفص کی سخت تیلیوں سے سر ذرا ٹکائیے

ذرا سی ایک آس پر کہ خوں بہا ملے کوئی
اب اپنا قتل کیجیے ہزار خوں بہائیے

اور اب تو کار و بارِ عشق بھی نہیں ہے بے سبب
جواب منفعت میں ہو تو پھر قدم اٹھائیے

مصیبتوں نے بے چراغ کر دیا اگر تو کیا
دیا بچھا دیا گیا ہے دل تو مت بچھائیے



کیسا احوال کہ جب رویا نہ گایا جائے
زخمِ دل اب کہیں چہرے پہ سجایا جائے

جاگتی آنکھوں میں اب کوئی بھی منظر نہ رہا
زندگی خواب سہی خواب دکھایا جائے

ہم کو مجبور نہ سمجھو تو سرِ بزمِ نفاق
آخری بار سہی ہاتھ بڑھایا جائے

بوریا ہی سہی پر خاک نشیں لوگوں کو
ایسے اعزاز کی زحمت سے بچایا جائے

اجنبی ہاتھوں کا احسان نہیں مجھ کو قبول
میرے قاتل کو مرے سنا منے لایا جائے

آخرب کوئی تو پیاروں کی نشانی رہ جائے
زخمِ دل دستِ میحاسے بچایا جائے

بزمِ مستی ہے گراں گوشوں کا انبوہ تو پھر
اب یہاں شور فقط شور مچایا جائے

اپنی مٹی میں ذرا اور میں رچ بس جاؤں
ہاں ابھی اور مرا خون بہایا جائے

دستِ ظلمت پہ تھی نجات نہ بیعت کر لیں
پھر سرِ شام دیا بھی نہ جلا یا جائے

جب تلک خواب نہ ٹوٹے کوئی آواز نہ دے
جب تلک موت نہ آئے نہ جگایا جائے

زمانہ میری شکستِ دل کا سوال ہی کیوں اُٹھا رہا ہے
ابھی مرے زخمِ ہنس رہے ہیں ابھی مرادِ دردگار رہا ہے

میں کب سے اُس تندی ہوا کے مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا
مگر یہ اک دستِ محرمانہ جو آج مجھ کو بچھا رہا ہے

عجیب بیگانگی کی رت ہے ہر ایک پہچان کھو گئی ہے
اب ایسے عالم میں دستِ قاتل ہے ایک جو آشنایا رہا ہے

میں بے سُخن اور مرافسانہ بھی ناشنیدہ رہا ہے لیکن یہ آج کیا ہے کہ جس کو سُنیے مری کہانی سُنا رہا ہے

نہ جانے دل کی شکستگی کے لیے ہے یا حوصلے کی خاطر
کوئی ہے جو خلوتِ سخن میں مرے لیے مُسکرا رہا ہے

کسی ہجومِ سخنِ سرائی میں یاد اُس کو کبھی تو کیجیے
جو گفتگو بے سخن رہی ہے وہ نغمہ جو بے صدا رہا ہے

اسیر کب یہ قفسِ سیاتھ لے کے اڑتے ہیں
رہے جو حسرتِ یروا ز پر میں رہنے دو

اے نفسی نفسی کی دُنیا اچھا لگا
 اپنا رونا اپنا گانا اچھا لگا
 یوں تو دل کے سارے زخم ہمارے ہیں
 لیکن ہم کو زخمِ تمنا اچھا لگا
 تیرہ شبی کو بابِ سحر تک پہنچا کر
 اب گھر چلیے "دل کا کہنا اچھا لگا

تیز ہوا میں اڑنا کس کے بس میں تھا
پھر بھی پل دوپل اہرانا اچھا لگا

اب یہ کہیں کیا کوئی تمنا سامنے تھی
بس اُس سمت کو بڑھتے جانا اچھا لگا

غم کے موسم نے یہ عجب احساس دیا
دردِ نیا اور زخمِ پُرانا اچھا لگا

ہوگا نشاطِ غم کا کوئی پیمانہ بھی
اچھا لگا تو آخر کتنا اچھا لگا

ساحلِ موج کے قرب میں کب تک لگتا جی
دیکھی دُور اک ناؤ تو دریا اچھا لگا

مت پوچھو ہر دور میں کیا گزری لیکن
ہر نئے دور میں گزرا زمانہ اچھا لگا

نغمہ نے سے خروشِ بیکراں پیوند ہو
شورشِ کرب نہاں سے جب فغاں پیوند ہو

پیشِ منظر ہو کہ پسِ منظر سبھی غرقِ سکوت
سوچتا ہوں اب یہ دردِ دل کہاں پیوند ہو

میں نے تو ہر ذرّہ صحر میں اکِ دل رکھ دیا
اب بہارِ جاوداں آئے یہاں پیوند ہو

شعلہ سحرش سمائے کیا لباسِ خاک میں
اب ہمارے پیرہن سے آسماں پیوند ہو

یہ زمین تو اس کران سے اُس کران تک ایک ہے
اب یہ جسم بے اماں چاہے جہاں پیوند ہو

رشتہ اک افلاک سے اور ایک رشتہ خاک سے
دل زمین و آسماں کے درمیاں پیوند ہو

زلیست کا ہر واقعہ تاریخ بنتا جائے گا
شرط یہ ہے داستاں سے داستاں پیوند ہو

درد ہے کہ نغمہ ہے فیصلہ کیا جائے
یعنی دل کی دھڑکن پر غور کر لیا جائے

آپ کتنے سادہ ہیں چاہتے ہیں بس اتنا
ظلم کے اندھیرے کو رات کہہ دیا جائے

آج سب ہیں بے قیمت گریہ بھی تبسم بھی
دل میں سنس لیا جائے دل میں رو لیا جائے

بے حسی کی دُنیا سے دو سوال میرے بھی
کب تک جیا جائے اور کیوں جیا جائے

داستاں کوئی بھی ہو جو بھی کہنے والا ہو
درد ہی سنا جائے درد ہی کہا جائے

اب تو فقر و فاقہ کی آبرُو اسی سے ہے
تار تار دامن کو کیوں بھلاسیا جائے

میرے کام بہت آتا ہے اک انجانا غم
روز خوشی میں ڈھل جاتا ہے اک انجانا غم

دن بھر میں اور کارِ زمانہ لیکن شام ڈھلے
ساتھ مرے گھر آ جاتا ہے اک انجانا غم

جانے پہچانے غم سارے بچھنے لگتے ہیں
اس دل پر جب لہراتا ہے اک انجانا غم

کتنے ہی دفتر فکر و سخن کے لکھ ڈالے تو کھلا
بس اتنا احوال لکھا ہے اک ”انجانا غم“

دو ہمدم ہیں راہِ وفا کے ساتھ نبھاتے ہیں
اک جانا بوجھارستہ ہے اک انجانا غم

لب جو کبھی خنداں بھی ہوئے تو اس احساس کے ساتھ
مجھ کو چھپ کر دیکھ رہا ہے اک انجانا غم



آواز میں آواز ملاتے ہی رہے ہم
 روتی ہی رہی رُوح سوگاتے ہی رہے ہم
 جل اُٹھنے میں جل جُھنے میں اک لمحہ لگاتھا
 پھر خاک سرِ زلیبت اُڑاتے ہی رہے ہم
 ہر خندہ بے ساختہ مقتول ہمارا
 ویسے تو ہنسے اور ہنساتے ہی رہے ہم

کب وسعتِ جاں سے ہے سوا وسعتِ صحرا
ہر ذرّہ صحرا میں سماتے ہی رہے ہم

مطلوبِ تماشا کو سرِ وادیٰ فرقت
جب تک نظر آیا نظر آتے ہی رہے ہم

اے عہدِ گراں گوشِ ترا حُسنِ سماعت ✓
ہم سے ہے کہ اک شور مچاتے ہی رہے ہم

چاند بھی بچھا ڈال دُل دکھانے والوں نے
کچھ اٹھا نہیں رکھا دُل دکھانے والوں نے

ہم نے خستگی پائی، دُل گرفتگی پائی
خیر ہم سے کیا پایا دُل دکھانے والوں نے

خوب و ضروری ہے زخم تازہ سے پہلے
ہم سے حالِ دل پوچھا دُل دکھانے والوں نے

بیقرار ہیں آنکھیں کیسے اب لہو روئیں
خشک کر دیا دریا دل دکھانے والوں نے

سچ کہا سدا دل کو دل سے راہ ہوتی ہے
خوب ہم کو پہچانا دل دکھانے والوں نے

اُن کی وجہ شہرت تو تلخ گفتگو ہی تھی
کیوں بدل لیا ہجہ دل دکھانے والوں نے



کارِ خلوصِ یار کا مجھ کو یقین آ گیا
اتنا شدید وار تھا مجھ کو یقین آ گیا

بس یونہی کچھ گماں ساتھ کوئی پسِ سخن بھی ہے
دردِ جلوبِ کشا ہوا مجھ کو یقین آ گیا

پھر وہ ہوا کا قہقہہ کان میں گونجنے لگا
اور بھی اک دیا بجھا مجھ کو یقین آ گیا

دائرہ وار تھا سفرِ عشقِ جنوں صفات کا
بہرِ وصال کچھ نہ تھا مجھ کو یقین آ گیا

اب مرادِ دُجھ گیا اب مر از خم بھر چلا
پھر وہی دوست آئے گا مجھ کو یقین آ گیا



کسی نے اک حرفِ زلیست پیہم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
 سو میں نے بھی اپنا شجرہٴ غم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
 بہ طرزِ تحریر نکہتِ گل بہارِ موسم کے ہاتھ نے تو
 وہی جو ہے زندگی کا ماتم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
 وصالِ لمحے نے بیکراں حشرِ موسموں کی نوید پاکر
 سلامِ آخر بہ چشیمِ پرِ غم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
 سیاستِ گلستاں عجب ہے کہ جاتے جاتے گلوں کی رُت نے
 بدستِ خود ہی خزاں کا موسم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
 غبارِ بار و درِ قصِ شعلہٴ دھمالِ میزائیلوں کا پیہم
 یہ کیسا منشورِ امنِ عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

عجب ہیں ہم یہ کس کی سعیِ لا حاصل پہ روتے ہیں
ابھی زندہ ہیں اور ناکامیِ قاتل پہ روتے ہیں

ہمیں رہ رہ کے طوفاں کی رفاقت یاد آتی ہے
ہیں اب آسودہ ساحل کھڑے ساحل پہ روتے ہیں

بہت ہم کوڑ لایا ماضی و امروز نے سواب
نشاطِ گریہ ایسا ہے کہ مستقبل پہ روتے ہیں

بہت آسودہ جاں ہیں سوا ب طوفانِ خوں اکثر
ہمارے دل سے اُٹھتے ہیں اس آبِ گل پہ روتے ہیں

گروہِ عاشقاں تھا شہرِ گریہ اُن کی منزل تھی
یہ رستے بھر بھی روتے آئے اب منزل پہ روتے ہیں

کہاں روتے ہیں ہسم آغازِ تینِخِ تعلق پر
جو کھینچی جا چکی ہے اُس حدِ فاصل پہ روتے ہیں

اچانک سارے رشتے سارے چہرے اجنبی ٹہرے
بھری محفل میں ہم ویرانی محفل پہ روتے ہیں



مرا جہاں ابھی میرا جہاں بنا ہی نہیں
زمین بنی ہی نہیں آسماں بنا ہی نہیں

ہزار سبز سہی رائیگاں سی لگتی ہے
وہ شاخ جس پہ کبھی آشیاں بنا ہی نہیں

سمندروں کا زمیں سے یہ انتقام غضب
اُٹھا بھی ابر تو ابر رواں بنا ہی نہیں

۱۹۸۸ء جشنِ میلادِ ۱۹۸۸ء جشنِ میلادِ ۱۹۸۸ء

کوئی بھی صورتِ حالات دیر پا نہ ہوئی
جو غم عزیز ہو جاوِ داں بنا ہی نہیں

جس انقلاب کی سُرخِ مرے لہو نے لکھی
وہ انقلاب مری داستاں بنا ہی نہیں

بہت سی اور بھی شرطیں ہیں کارواں کے لیے
ہجوم سے تو کبھی کارواں بنتا ہی نہیں

اسیرِ جراثِ پرواز آزمانے لگے
وہ تازیانے لگے ہوش سب ٹھکانے لگے

ہوا کا دستِ کرامت کہوں کہ کھیل کہوں
دیا بچھانے لگے اور کبھی جلانے لگے

سخنِ محاسبہ ایسا، اگر میں جھوٹ لکھوں
ردیفِ تنگ کرے قافیہ ستانے لگے

رہے یہ جس مگر اس قدر ہوا تو چلے
کہ ڈوبتی ہوئی یہ سانس آنے جانے لگے

کچھ ایسے زخم ملے ہیں شناسا چہروں سے
کہ اب جو آئینہ دیکھوں تو خوف آنے لگے

ہوا کی شاخ پہ خوشبو کا ایک پھول کھلا
یہ کارِ فن تھا سو اس میں ہمیں زمانے لگے

حجرۂ ذات سے باہر تو نکل کر دیکھو
تم کسی دوسرے پیکر میں بھی ڈھل کر دیکھو

کیا عجب تم کو ہی یہ ہمسفری اس آجائے
دو قدم ہی سہی تم ساتھ تو چل کر دیکھو

کچھ نہ کچھ یوں بھی تو افکار نکھر سکتے ہیں
خونِ دل چہرہ افکار پہ پل کر دیکھو

ہاں یہ دستارِ فضیلت بھی قبائے زر بھی
خود کو دیکھو تو یہ پوشاک بدل کر دیکھو

موسمِ سحر کوئی رُت ہے نہ کچھ آب و ہوا
اک تقاضا ہے کہ پھر گھر سے نکل کر دیکھو

مات ہو جائے مگر حوصلہٴ دل کے لیے
آخری چال جو باقی ہے وہ چل کر دیکھو

شکستِ دل میں بھی اک زندگی نظر آئی
دیا بُجھا تو ہمیں روشنی نظر آئی

فرازِ دار پہ کوئی ہمیں نہ پہچانا
زمانے والوں کو خوش قامتِ نظر آئی

سرِ دیار و فادوستوں کے جھڑمٹ میں
دریدہ جسم لیے دوستی نظر آئی

لہو لہان ہوئے سنگِ دوتاں سے تو آج
دیارِ جاں میں بھی رونق نئی نظر آئی

اب اور طرے سے نقارہ خدا کو بجے
زبانِ خلق تو خاموش ہی نظر آئی

نماش جب بھی کیا روشنی کا پس منظر
فضا میں دُور تک تیرگی نظر آئی

وہ رکھ رکھاؤ نہ دیکھا دیے کے جلنے میں
جو اس کے بچھنے میں شائستگی نظر آئی

اب کام نہیں کوئی جُز کارِ عزاداری
جب رو لیے جی بھر کے پھر رونے کی تیاری

اب تو یہی موسم ہے اور قریب جاں اپنا
کچھ درد کی چہکارس کچھ زخموں کی گل کاری

جی چھوڑ کے بیٹھا ہو جو قافلہ رستے میں
اب اُس کی بلا جانے ہو جس کی ہو سالاری

ہر سال لگاتے ہیں ہم پودہ کدورت کی
ہر سال ہی کرتے ہیں ہم دل میں شجر کاری

جینے کے لئے آخر جینے کا ہنر سیکھا
اب کا ہے کا اندیشہ اب کون سی دشواری

اب عشق ہوا آساں اور اب تو یہ صورت ہے
دلداروں سے دلداری عیاروں سے عیاری



کبھی ہوا تو کبھی خاکِ رہگزر ہونا
مرے نصیب میں لکھا ہے دربہ در ہونا

اگر چلو تو مرے ساتھ ہی چلو لیکن
کٹھن سفر سے زیادہ ہے ہمسفر ہونا

اُداس اُداس یہ دیوار و دربتا تے ہیں
کہ جیسے راس نہ ہو ان کو میرا گھر ہونا

ہوانے سیکھ لیا ہے جو شعلگی کا چلن
تو پھر عبت ہے نہ ہونا کہ بال و پر ہونا

قدم اٹھے بھی نہیں اور سفر تمام ہوا
غضب ہے راہ کا اتنا بھی مختصر ہونا

یہ دورِ کم نظراں ہے تو پھر سُنہرے کا زیاں
جو ایک بار نہ ہونا تو بیشتر ہونا

ہے کرامت مے دل کی ترے نواک کی نہیں
وار ہو ایک مگر زخم بہتر آجائیں

گفتگو آج تو دو ٹوک کرے گا سورج
ظلِ سبحانی شبستان سے باہر آجائیں

شب کو یلغارِ تفکر سے جو بچ نکلوں میں
صبح دم تازہ خبیالات کے لشکر آجائیں

اتنی سفاک سماعت بھی غضب ہے کہ جہاں
بات پوری بھی نہ ہو ہاتھوں میں پتھر آجائیں



قرار غم زدگاں کیا یہی کہ رولینا
بچھے جو زخم تو نشر نیا چھولینا

نہ کوئی سمت نہ جادہ مگر یہ عالم ہے
کہ صبح ہوتے ہی سورج کے ساتھ ہولینا

ملے جو عرصہ فرصت میانِ ہجر و وصال
سو تم بھی روح کی غلوت سرا میں سولینا

نہ لہلہائیں مرادوں کی کھیتیاں جن میں
تم ایسی آنکھوں میں خوابوں کی فصل بولینا

وہ فرقتوں میں ہے شاداں سو تم بھی لڑگاں
غمِ شراق میں آسودگی سے مولینا

کے ساتھ ہیں وہ تو ہم خاک و ہوا کے ساتھ ہیں
پھر بھی مسافتوں کے قرض گردشِ پاک کے ساتھ ہیں
سوچ رہے تھے ہم چلو یہ شبِ غم کٹی مگر
اب وہی ساری کلفتیں بادِ صبا کے ساتھ ہیں
اس نئے دور کی نئی چسارہ گری تو دیکھیے
بے اثری دُعا کے ساتھ دردِ دوا کے ساتھ ہیں

کیا اسے بے حسی کہوں اب جو نہ دادِ فن ملے
کرب تو سائے زلیست کے آج نوا کے ساتھ ہیں

یاد ہے اس قدر کہ ہم خوب بھٹک چکے مگر
اب اسے کیا کہیں کہ ہم راہ نما کے ساتھ ہیں

ہم تو مثالِ برگ ہیں اپنا قیام و کوچ کیا
کل تھے شجر کے دوش پر آج ہوا کے ساتھ ہیں

یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر
یہ کائنات ہے سب کا گھر

گاؤں اب کے بچ نکلا ہے حیرت ہے
 دریا پیاسا لوٹ گیا ہے حیرت ہے
 یہ ویران حویلی کس کو بھائی ہے
 دل میں کوئی آن بسا ہے حیرت ہے

رُت پھر لوٹ آئی ہے زرد گلابوں کی
 وقت بھی کیا جلدی بیتا ہے حیرت ہے

بستی بستی سٹاٹوں کا راج ہے اب
صحرا صحرا شور بپا ہے حیرت ہے

خوشحالی بوئی تھی لیکن اب دیکھا
کھیت میں تو افلاس اگا ہے حیرت ہے

منظر کیا تھے راہ میں بستی آنے تک
راہی سب کچھ بھول چکا ہے حیرت ہے

نتھے دیے کی جڑات وہمت دیکھو تو
کیسا شب آسام ہوا ہے حیرت ہے

ایک سی تعبیریں ہیں خوابوں کی لیکن
ہر شب خواب نیا دیکھا ہے حیرت ہے

بے حسّی وقت کی آواز بنادی جائے

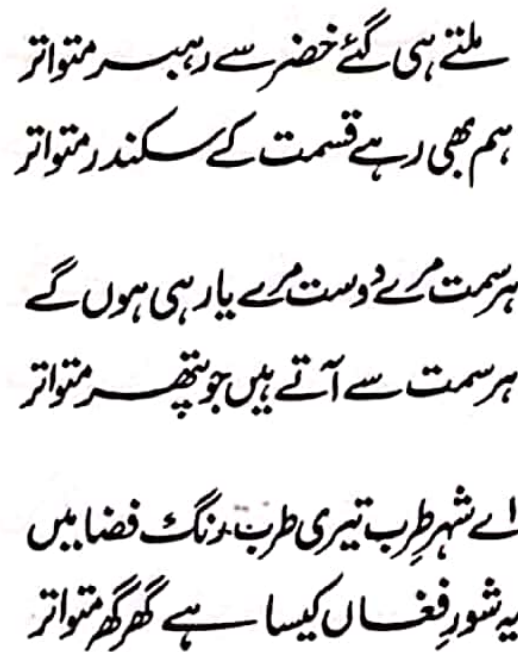
صرف سُورج کا نکلنا ہے اگر صبح تو پھر
ایک شب اور مری شب کے ملا دی جائے

شرط اب یہ تو نہیں دل سے بھی دل ملتے ہوں
صرف آوازیں آواز ملا دی جائے

بے ضرورت ہو ملاقات ضروری تو نہیں
بزم کے ساتھ ہی یہ رسم اٹھا دی جائے

صرف جلنا ہی نہیں ہم کو بھڑکنا بھی تو ہے
عشق کی آگ کو لازم ہے ہوا دی جائے

اور اک تازہ ستم اُس نے کیا ہے ایجاد
اُس کو اس بار ذرا کھل کے عادی جائے



کیا سرو قدی قامتِ فن یوں ہے کہ جیسے
سائے رہیں سیالوں کے برابر متواتر

تھی شورشِ جاں جوشِ رہائی سے زیادہ
دیواروں میں بنتے ہی گئے در متواتر

پھر قافلہ یادوں کا ٹہر جاتا ہے اور پھر
وہ اُس سے بچھڑ جانے کا منظر متواتر

اِس خموشی کی زباں کچھ اور ہے
لہجہ لب بستگاں کچھ اور ہے

واقعہ در واقعہ جو زلیست تھی
داستاں در داستاں کچھ اور ہے

ہم کو بھی ہے پاسِ رسم کو کہن
لیکن اب رسم جہاں کچھ اور ہے

انتہائے ہمرہی کے باوجود
فاصلہ تاحد جاں کچھ اور ہے

چارہ غم ہے نشاط افزائے غم
میرا غم اے مہرباں کچھ اور ہے

دل میں ہیں معنی کے کیا کیا خدو خال
چہرہ لفظ و بیاں کچھ اور ہے

یہ زرد چاند رُوح کا قرار کیسے ہو گیا
اک آسماں نثر اد میرا یا ر کیسے ہو گیا

وہ ایک عمر کی کڑی ریاضتیں کہاں گئیں
یہ آج میرا غم، مجھی پہ بار کیسے ہو گیا

بھلا یہ کون پوچھتا مناسفتوں کی گرد سے
وہ چہرہ آفتاب سا غبار کیسے ہو گیا

اگر نشاطِ درد سے نہیں ہیں آشنا تو پھر
ہمارا اہلِ درد میں شمار کیسے ہو گیا

یہ جو دل بہ دل اب تک یاریاں بہت سی ہیں
خوش گمانیاں شاید درمیاں بہت سی ہیں

ایک خوابِ نادیدہ روز ٹوٹ جاتا ہے
زخم خوردہ آنکھوں میں کرحیاں بہت سی ہیں

اب حصارِ شہرِ دل توڑ کر بھی دیکھو تم
بستیوں کے باہر بھی بستیاں بہت سی ہیں

ہاں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یوں ادھر قفس میں بھی تیلیاں بہت سی ہیں
 اب کے موسمِ گل میں رقصِ بیکراں ہوگا
 یادگارِ دیوانہ دھجیاں بہت سی ہیں
 جانتے تو ہیں کیا کچھ دستِ منصفی میں ہے
 پھر بھی سرد ہاتھوں میں عرضیاں بہت سی ہیں

یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں
 یاد آئے ہیں وہ مہرباں تنکے یاد آئے جاتے ہیں

زخم دے تو اک نیا تیر چلا دیا کرو
دوستو اپنا لطفِ خاص یاد دلا دیا کرو

شہرِ طلب کرے اگر تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

ایک علاجِ دائمی ہے تو برائے تشنگی
پہلے ہی گھونٹ میں اگر زہر ملا دیا کرو

پیاسی زمین کو تو ایک جرعہ خون ہے بہت
میرا لہو نیچوڑ کر پیاسےس بچھا دیا کرو

سادہ دلوں سے دُور کیا سارے عذاب بھول جائیں
کر کے اُنہیں لہو لہان پیارِ جتنا دیا کرو

مقتلِ غم کی رونقیں ختم نہ ہونے پائیں گی
کوئی تو آہی جائے گا روزِ صدا دیا کرو

جذبہ خاک پروری اور سکون پائے گا
خاک کرو ہمیں تو پھر خاک اُڑا دیا کرو



بے زمین پودے بھی اہل ہائے ہیں کیا کیا
ہم بھی زخم کھا کھا کر مسکرائے ہیں کیا کیا

ملگے اندھیروں میں جھلملانے والے بھی
شب گزیدہ لمحوں میں جگمگائے ہیں کیا کیا

آسمان کی بیگاریں کچھ زمیں کی بیگاریں
ہم سے ناتوانوں نے بوجھ اٹھائے ہیں کیا کیا

سرسری سے رشتے بھی عارضی سے رشتے بھی
اب کے شام تنہائی یاد آئے ہیں کیا کیا

اپنی وضع داری کی داستان مسلسل ہے
زخم کھائے تھے کیا کیا زخم کھائے ہیں کیا کیا



دل تجھے راسِ آئیں گی حشر میں سب سمیٹ لے
 اور کوئی طلب نہ رکھ دستِ طلب سمیٹ لے
 غم کدہ حیات میں بس یہی شمعِ جاں تو ہے
 کتنی بڑھائے لو کہ سب ظلمتِ شب سمیٹ لے
 اب یہ متاعِ رائیگاں کون کرے طلب یہاں
 ہاں یہ دوکانِ فکر و فن خیر سے اب سمیٹ لے
 خاک ہوں خاک پروری دستِ ہنر کا اختیار
 چاہے وہ جب بکھیر دے چاہے وہ جب سمیٹ لے
 منظرِ ہست و بود سے کیا ترا جی نہیں بھرا
 اب یہ بساطِ کُن فکاں اے مرے رب سمیٹ لے

میرا کھول آنا خیر سے خالی نہ ہوا
میں تہی دست رہا پھر بھی سوالی نہ ہوا

خندہ معزول ہوا لب سے ہوا اک بار تو پھر
کٹ گئی زلیست مگر حکم بجالی نہ ہوا

درد خاموش ہوا زخم بھی میر جھباہی گیا
عارضی دوست تھے سب کوئی مثالی نہ ہوا

وہ بدلتا ہی گیا مصلحتِ وقت کے ساتھ
وہ سوسہ دل کا فقط خام خیالی نہ ہوا

سخنِ پرشِ غم بھی ترے خود داروں کو
حرفِ احسان لگا خیر سگالی نہ ہوا

رتبہِ خاک نشینی تھا بہت ہم کو کہ پھر
کوئی اعزازِ جہاں رتبہِ عالی نہ ہوا

خواب ہی کہیے کہ تھا صحنِ گلستاں کے قریب
خواب ٹوٹا سو کھڑا ہوں درِ زنداں کے قریب

جبر کہتا ہے کہ اب اُس کو خداوند کہو
ایک شمشیر جو رقصاں ہے رگِ جاں کے قریب

کیا یہی اشکِ ندامت ہے جو رخشندہ ہے
آپ کی جان سے دُور آپ کی مژگاں کے قریب

خواہش وصل کو پورا نہیں ہونے دیتا
حادثہ کوئی چھپا بیٹھا ہے امکاں کے قریب

اتنا اُجڑا تو نہ تھا جیسا کہ اب لگتا ہے
جب سے اک قصر بنا خانہ ویراں کے قریب

تم کو تو فتح منانی ہے مناؤ لیکن
ہو بیا جشنِ طرب گنجِ شہیداں کے قریب

بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے
بیتِ کربلا کی مٹا دی گئی ہے

ہو گئے کیا وہ غزل خواں خاموش
بستیاں چُپ ہیں بیاباں خاموش

اشکِ غمِ اشکِ ندامت تو نہیں
کیوں رہے گا سرِ مَرگاں خاموش

اب تو بس دردِ قہرِ ادیت ہے
ہو چکا کب کا وہ درماں خاموش

کیا ہوا اب کے بہاراں میں بھی
رہ گیا کیوں درِ زنداں خاموش

میری ہجراں نسی جانتا ہے
ہے جویوں وصل کا امکاں خاموش

حادثہ رونڈ چکا مجھ کو تو پھر
دیکھتا رہ گیا حیراں خاموش

آخری حرفِ دعا تھا وہ دیا
پھر ہوئی بزمِ چراغاں خاموش



بے سروپا بات سے بات نکالی گئی
ذوقِ نظر کے بغیر بزمِ سجا لی گئی

شعلہ اظہارِ شوق کیسے نمودِ پاسکے
اُس پہ تو ہر دور میں خاک ہی ڈالی گئی

زلیلت کے اسرارِ غم مجھ سے ہی جانے گئے
میرے ہی احوال سے فال نکالی گئی

میں نے تو اُس بزم میں دل بھی لہو کر لیا
مجھ سے ہی اس بزم میں آنکھ چرائی گئی

حرفِ سخن کیا کہ لوگ اتنے سخن سیر ہیں
رسمِ سماعت جو تھی وہ بھی اٹھالی گئی

کیا کوئی فردا کا غم اُس کو نظر آگیا
چہرہ امروز سے آج بحالی گئی

شعلہ بجاں عشق کا کیا یہی انجام ہے
آگ بجھادی گئی راکھ بچپالی گئی

بے ارادہ زندگی بھر رقص فرماتے رہے
ہم فریبِ زندگی کھلتے رہے گاتے رہے

آپ نے اچھا کیا وہ وار آخر کر دیا
دل میں اندیشے بہت تھے خیر اب جاتے رہے

یا تو سُرُجِ دیر سے نکلا تھا کُن یا آنکھ میں
شبِ گزیدہ ہجر کے سائے سے لہراتے رہے

وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے پر کیا کریں
ہم کہ چشم دوستاں کی بھی خبر پاتے رہے

کوئی دیکھے کیسے بس جاتی ہیں دل کی بستیاں۔
غم کہیں کے تھے مگر اس دل میں سب آتے رہے

دوستی بھی مصلحت تھی دشمنی بھی مصلحت
یوں ہمارے درمیاں رشتے رہے ناتے رہے



کربِ نہاں کو کچھ بھی حرفِ سخن بنا سکے
ورنہ یہ شورِ بے صدا کس کی سمجھ میں آ سکے

اب مرا سیلِ تشنگی ریگِ رواں سے مل گیا
کون ہے اس فضا میں جو پیر کے پار جا سکے

دردِ فراق و زخمِ سر سب ہی تھے امتحاں مگر
درد کہاں دکھا سکے زخم کہاں چھپا سکے

اب رہ و رسمِ دوستی بس ہی ہو کے رہ گئی
کوئی فریب دے سکے کوئی فریب کھا سکے

کوئی نہیں سفر کی شرط جو بھی چلے چلے مگر
درد سے تیز اُٹھ سکے جان سے تیز جا سکے



دُشنام سُنا جائے ہر جبر سہا جائے

اے شرطِ ادب کب تک خاموش رہا جائے

یہ اپنی کہانی بھی کچھ کم تو نہیں یارو

کب تک غمِ دنیا کا افسانہ کہا جائے

ہم کھیل بنیں کب تک اُس دستِ زمانہ کا

جو وار کرے اور پھر خود وار بچا جائے

آغاز سے پہلے ہی انجام کی زد پر ہے

کہنے کو ہوا آئے اور شمع بجھا جائے

صورت گر دُنیا ہیں اپنی بھی تمنائیں

جیسے کوئی پانی پر کچھ نقش بنا جائے

پس غبارِ جواک آشنا سا چہرہ ہے
وہ مجھ کو بُوجھ رہا ہو اگر تو اچھا ہے

اب ایک عمر کی محرومیوں کے بعد یہ وصل
فریبِ دیدہ و دل ہے کہ خواب دیکھا ہے

عجب نہیں کہ ہمارے بھی لب سنسے ہوں کبھی
ہجومِ غم میں بھلا کس کو یاد رہتا ہے

مری نظر نے یہ انداز بے یقینی کا
فریبِ عہدِ بہاراں کے بعد سیکھا ہے

ہزار سایۂ دیوار و در میں ہوں لیکن
مرے وجود میں اک بے کنار صحرا ہے

کوئی بھی رُت ہو کھلیں پھول ناامیدی کے
سدا بہار تو بس نخل آرزو کا ہے

یہ ابر کیسا جو بے کیف کر گیا مجھ کو
وہ دھوپ کیا ہوئی جس سے بدن جھلستا ہے

سر کُہسارِ غم، اک خطبہ تلقینِ غم ہوگا
چلو سُن آئیں لوگو دل کا غم، اب یوں ہی کم ہوگا

عجب کیا جو مرا جامِ سفالیں قیمتی ٹہرے
یہ سنتے ہیں کہ کل ہر ہاتھ میں اک جامِ حَم ہوگا

بس اب کیا پیش و پس یہ فیصلہ تو کر لیا میں نے
قلم ہی سر کی قیمت ہے تو پھر سر ہی قلم ہوگا

!! جشنِ میلادِ ۱۹۸۸ء جشنِ میلادِ ۱۹۸۸ء جشنِ میلادِ ۱۹۸۸ء !!

یہی کارِ بہرِ مندیِ نصابِ زندگی ٹہرا
 فسانہ زندگی کا زندگی بھر ہی رقم ہوگا
 رفیقو بیکراں شوقِ سفر میں قُربِ منزل کیا
 یہاں تو جو قدم اُٹھے گا وہ پہلا قدم ہوگا
 کسی کو یاد رکھنے میں کسی کو بھُول جانے میں
 مالِ کارِ اک غم ہے ہی غمِ بیش و کم ہوگا

زخمِ دل کی روشنی ہے زخمِ کھانا چاہیے
جب تک بھی دم میں دم ہے جگمگانا چاہیے

فصلِ گل کیوں مضحل ہے زیرِ دامنِ بہار
یہ طلسمِ رنگ و بُو اب ٹوٹ جانا چاہیے

دوستی کو ایک عزمِ معتبر درکار ہے
دُشمنی کو ایک لمحہ اک بہانا چاہیے

ایک بزمِ رفتگاں دل میں مرے آباد ہے
کیا مجھے اس بزم میں اب بیٹھ جانا چاہیے

ضبط کی سُوکھی زمیں کو کھیتوں کی ہے طلب
آہیں بونی چاہئیں گریہ اگانا چاہیے

درد کی لے وقت سے آمیز ہو جائے تو پھر
خوب رونا چاہیے اور خوب گانا چاہیے

نارسیدہ آہ کے ہمراہ میں بھی ڈوب جاؤں
یا نیا اک آسماں سر پر اٹھانا چاہیے



میں سمجھا مری گھٹن مٹانے آیا تھا
وہ جھونکا تو دیا مجھ سے آیا تھا

موسم گل اس بار بھی آیا تھا لیکن
کیا آیا بس خاک اڑانے آیا تھا

چشم زدن میں ساری بستی ڈوب گئی
دریا کس کی پیاس بجھانے آیا تھا

مہر نشاں، زر کا رقبہ، وہ یار مرا
مجھ کو سنہرے خواب دکھانے آیا تھا

خالی چھتری دیکھ فیرہ لوٹ گیا
بچھڑا پیچھی اپنے ٹھکانے آیا تھا



طلوعِ ذات سے لے کر غروبِ ہستی تک
بس اک سفر ہے تمنا سے نا اُمیدی تک

ہوں محو دید مگر کچھ نظر نہیں آتا
سماعتیں ہیں فقط گوش کی گرانی تک

ہزار رنگ مرے گردنا چتے ہیں مگر
پڑی نہ ذہن کے پردے پہ ایک دھاری تک

نہ آنکھ کھول سکوں اور نہ خواب دیکھ سکوں
عذاب بن گئی آخر یہ شب گزاری تک

تھے بے چراغ دریچے سو بے قیام گیا
وہ ایک شخص کہ آیا تھا دل کی بستی تک

پھر تو ساری زلزلت ہماری خواب نماگری
ہائے وہ پہلا خواب جو دیکھا تھا بیداری میں



اسی شہرِ طرب کے درمیاں تعمیر کرنا ہے
ہمیں اک گوشہٴ آہ و فغاں تعمیر کرنا ہے

مے پیاروں کا میرے دوستوں کا پھر تقاضا ہے
مجھے اک اور شیشے کا مکاں تعمیر کرنا ہے

نظر کے سامنے اک تیرہ و تار یک منظر ہے
اسی سے اب امیدوں کا جہاں تعمیر کرنا ہے

زمین کو ہم نے اپنی خواہشوں جیسا بنا ڈالا
الگ اب ایک اپنا آسماں تعمیر کرنا ہے

بجز اک حسرتِ تعمیر کچھ بھی تو نہیں اپنا
وہ پیارا آشیاں لیکن کہاں تعمیر کرنا ہے

بہ پاسِ خاطرِ سرکار کیا نہیں کرتے
ہیں دلِ فگار مگر دل بُرا نہیں کرتے

ہماری ذات میں محشر بپا ہے مدت سے
مگر یہ ہم کہ کوئی فیصلہ نہیں کرتے

غبارِ راہ سے آگے نکل گئے ہوتے
جو رک کے پاؤں سے کانٹے جدا نہیں کرتے

وہ دل پہ وار بھی کرتا ہے یہ بھی کہتا ہے
کہ ”دل کے زخم عجب ہیں بھرا نہیں کرتے“

اب اور پاؤں نہ پھیلائے اس تھکن سے کہو
کہ ہم سفر میں زیادہ رُکا نہیں کرتے

شکستِ شیشہ دل کی صدا ہی سُن لیتے
وہ توند جو کسی کی سُننا نہیں کرتے

شوق کو کب رختِ سفر چاہیے
تیشہٴ فرہاد مگر چاہیے

اے مری آشفۃٴ سری کیوں تجھے
بزمِ جہاں زیرِ وزر چاہیے

کوئی مرے درد کا سودا کرے
کون ہے جس کو یہ گہر چاہیے

رُوح کا کیسا ہی زیاں ہو مگر
نفس کو اک لقمہ تر چاہیے

میری طرح دشت بھی مجبور ہے
اُس کو بھی اک خاک بسر چاہیے

میر کے اندازِ سخن کے لیے
صرف ہنر کیا ہے جگر چاہیے

جس کو خداوند نے
جس کو خداوند نے
جس کو خداوند نے
جس کو خداوند نے
جس کو خداوند نے
جس کو خداوند نے



خود ہی رُوٹھے ہو تو پھر اس کا مداوا کیوں ہو
ہم نہ کہتے تھے کہ ہاں رنجشِ بے جا کیوں ہو

ہر بشر اپنی پریشاں نظری کے باوصف
خود تماشا ہے تو پھر محو تماشا کیوں ہو

شہر در شہر میں رسوائیٰ لیے پھرتا ہوں
اب فزول اور ترے پیار کا چہرہ چا کیوں ہو



ہے بہت خواہشِ آزادیِ گرفتار ہمیں
شوق اب کھینچ کے لے جائے سردار ہمیں

اُس نے دونوں کو نوازا ہے مگر فرق کے ساتھ
تاج و اورنگ تمہیں جبراً تظہار ہمیں

جسم کی زینت و آرائش و خوبی تھے مگر
روح کا بوجھ لگے مجھ و دستار ہمیں

ہم رہے جس کے لیے مثلِ صبا آوارہ
کر گئی ہے وہ نظرِ نقش بہ دیوار ہمیں

کچھ تو وہ خواب ہی تھے جاگتی آنکھوں کے لیے
کچھ رکھا خوابوں کی تعبیر نے بیدار ہمیں



کیوں باک مجھے صدق کے اظہار میں آوے
غالب کا ہے فیضان جو اشعار میں آوے

بے باکی و حق گوئی کی تشبیہ بھلا کیا
کچھ شائبہ آوے بھی تو تلوار میں آوے

بے مہری ایام نے فطرت ہی بدل دی
کیا لطف ہمیں پیار کی گفتار میں آوے

حیراں سہی لیکن اُسے سینے سے لگالے
آئینہ اگر صورتِ جاں دار میں آوے

خوں آب ہو گر جہدِ غمِ عشق میں یارو
تب موجِ خنک دیدہ خوں بار میں آوے



اب خواہ کھلے کہ ابربر سے
پانی تو گزر چکا ہے سر سے

اے تشنگی دریدہ دامن
کب تک ہے نباہ چشم تر سے

تھے زہرہ جبین ہزار لیکن
ہم چاند سی صورتوں کو تر سے

۱۶۳

شاید ہی دل کے فاصلے ہیں
کچھ بھی تو نہ کم ہوئے نظر سے

کچھ سوچ کے لوٹ آئے ورنہ
ہم دُور نکل چکے تھے گھر سے

اندازہ ہوا کے پیچ و خم کا
ہوتا ہے شکستہ بال و پر سے

زندگی کے دامن میں رنگ و نور و مکہت کیا
خواب ہی تو دیکھا ہے خواب کی حقیقت کیا

دل بھی قفلِ ابجد ہے ایک نام پوچھے ہے
جان لے تو کھل جائے آخر اس میں حیرت کیا

درد تو ہے پیمانہ ظرفِ متند لوگوں کا
ورنہ اے دلِ مضطر درد کی ضرورت کیا

آپ کے رویہ پر خوش گمانیاں کیسی
کوئی مصلحت ہوگی ورنہ یہ عنایت کیا

چوبِ خشکِ صحرا ہوں اور آرزو گل کی
سادگی سے بڑھ کر بھی ہے کوئی حماقت کیا

یاس کا اندھیرا بھی، آس کا اُجالا بھی
لوگ اسی کو کہتے ہیں جھٹپٹے کی ساعت کیا



کیوں تجھے اشک بد اماں دیکھا
تو نے کیا دیدہ حیراں دیکھا

یہ الگ بات کہ سب راہ میں تھے
ہم نے گلشن نہ بیاباں دیکھا

لوگ جس چہرے کو گل کہتے ہیں
ہم نے اُس گل میں گلستاں دیکھا

اُس نے یوں ٹوٹ کے چاہا مجھ کو
چاکِ دامن نہ گریباں دیکھا

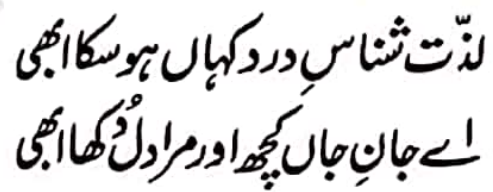
لوٹ آیا ہوں اُسی قریے میں
پھر دریچہ وہ فرزاں دیکھا

دل میں پھر سوئی تمنا جاگی
ضبط میں کرب کو نہ ہاں دیکھا

اُس کے چہرے پہ بھی حیرانی تھی
حال اپنا بھی پریشاں دیکھا

پھر ہمیں بحرِ نصیبی یاد آئی
پھر بچھڑ جانے کا امکان دیکھا

اک ستارہ سرگردوں ٹوٹا
اشکِ غم اک سرِ مژگاں دیکھا



شاید مجھے وہ بھول گیا ہے کہ ناگہاں
آئی شکستِ شیشہ دل کی صدا بھی

مجھ کو خیال تک نہ رہا دھوپ ٹھہل چکی
میں منتظر کہ لوٹ کے آئی صبا ابھی

پھر دیکھنا خیال کی نڈرت مہنر کا رنگ
کچھ دستِ دوستاں سے نئے زخم کھا بھی

ہنس لے اس ایک لمحہ آسودگی میں تو
غافل سنبھل کہ درد کا طوفاں اُٹھا بھی

یہ دور ساز گار ہی کب ہے کہ ہو غزل
اے شوق اُس کا ذکر نہ کر بھول جا بھی

مُدعا یوں میری وحشت کا نہ عنفا ہوتا
زلیست کو تم نے جو نزدیک سے دیکھا ہوتا

آپ بھی لذتِ جاں سوز کے قائل ہوتے
آپ نے دل پہ کوئی زخم تو کھایا ہوتا

وہ جنہیں خمبیہ زرتار میسرتھا کبھی
آج کہتے ہیں کہ بس دھوپ میں سایا ہوتا

بند تھی آنکھ تو در آئے تھے منظر کیا کیا
سلسلہ خواب کا اے کاش نہ ٹوٹا ہوتا

کیا قیامت تھی اگر نرم نہ برہم ہوتی
کوئی دم میری بھی وحشت کا تماشا ہوتا

پھر اسی شخص سے اک بار محبت کرتے
وقت بے مہر اگر لوٹ کے آیا ہوتا



گھریا تو آئے گا مگر ٹھیک رہے گا
یہ ہجر کا موسم ہے سفر ٹھیک رہے گا

ہاں ذات کے ننداں سے نکلتا تو ہے لیکن
اب کون سی دیوار میں در ٹھیک رہے گا

تازہ لیت بھٹکنا ہی مقدر ہے تو اے دل
اپنے ہی خیالوں کا نگر ٹھیک رہے گا

یہ پوچھتی رہتی ہے مری چشم تماشا
کیا مجھ سے بونہی صرف نظر ٹھیک رہے گا

ہاں تہمتِ ایشاد و وفا ہم پہ سجے گی
الزام تو یہ اپنے ہی سر ٹھیک رہے گا

نہ پوچھیے کہ کہا کیا ہے اُن کہی کیا ہے
عذاب جھیل رہا ہوں سمنوری کیا ہے

عجب ہے ذوق تماشا کہ گھر جلا کر لوگ
یہ چاہتے ہیں سمجھنا کہ روشنی کیا ہے

پسِ نظر ہو اگر مقصدِ حیات تو پھر
یہ زیستِ وقت گزاری ہے زندگی کیا ہے

میں ملتی ہوں نہ وہ ملتفت مگر پھر بھی
یہ ایک آگ دلوں میں لگی ہوئی کیا ہے

میں دل کے داغ دکھاؤں کہ زخمِ سرن کو
جو پوچھتے ہیں کہ مفہوم دوستی کیا ہے

خوشی کے ساتھ ہی آنکھوں کیوں چھلک جانا
یہ ایک کیفیتِ ربطِ باہمی کیا ہے



اک خُشک موجِ صبا کے مانند
کوئی آتا ہے جیسا کے مانند

آپ کے حُجر کا پتہ صحرا
اور ہم آبلہ پا کے مانند

کوئی تمثیل نہیں پاؤ گے
میرے ایشار و وفا کے مانند

ہائے یہ کس نے پکارا مجھ کو
نرم ہجہ تھا صبا کے مانند

پی لیا زہر کا سا غم ہم نے
جرعہ آبِ بختا کے مانند

خونِ دل ہے جو نظر آتا ہے
دستِ قاتل پہ جنا کے مانند

یہ نیا دور بڑے پیار کے ساتھ
زہر دیتا ہے دوا کے مانند

نئے غم جب کسی عنوان ملے ہیں
بہ فرط شوق آنسو آگئے ہیں

ہمیں یہ دھوپ ہی پیاری ہے لوگو
کہ ہم اس دھوپ میں جلتے رہے ہیں

ہم جو درد مند ان تھکا مگر ہم
بہ فیضِ دوستان تنہا رہے ہیں

ہمیں آشفگی ہی را س آئی
سو پھر صحر اکی جانب چل دیے ہیں

وفا نا آشنا خود ہم ہی ٹہرے
کہ اُس کو با وفا سمجھے ہوئے ہیں

ہمارا چاک دامن ہو کہ گل کا
جو یوں نکلیں وہ دامن کب سلے ہیں

بہت رسوا سہی پھر بھی سُخن سے
تمہارے شہر کو مہکار ہے ہیں

کب ہوا آئینہ حیرانِ مقابل کے سوا
دل کسی کی بھی نہ مانے گا کبھی دل کے سوا

نام کیا دوں کہ یہ اُفتادنی ہے مجھ پر
زہر لگتا ہے سبھی یار کی محفل کے سوا

اے خوشا ذوقِ شہادت کہ تری بن آئی
راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

موج در موج فقط میری ہی بیتابی ہے
 رازیہ کون سمجھ پائے گا ساحل کے سوا

اب مرارہ نما مجھ سے ہی کہتا ہے
 تم نکل جاؤ کسی سمت بھی منزل کے سوا

ذوقِ نظارہ کو اتنا بھی نہ ارزاں جانو
 اک طلب اور بھی ہے قیس کو محمل کے سوا

ایک دن ایک لکڑی والا
 ایک دن ایک لکڑی والا
 ایک دن ایک لکڑی والا
 ایک دن ایک لکڑی والا
 ایک دن ایک لکڑی والا
 ایک دن ایک لکڑی والا



وفا شناس نہ وہ دل لگانے والا ہے
سو اپنا حال بھی اب تو زمانے والا ہے

میں اک شجر ہوں مگر ایسے دشت میں کہ جہاں
نہ آنے والا ہے کوئی نہ جانے والا ہے

عزیز و کب سے ہوئی آشنائی جرم کہ اب
ہر ایک بزم میں آنکھیں چُرانے والا ہے

یہ ناگہاں جو ہوئی سہم کر فضا خاموش
کچھ ایسا لگتا ہے طوفان آنے والا ہے

خبر نہ تھی کہ بچا یا ہے آندھیوں سے جسے
وہی چراغ مرا گھر جلانے والا ہے



دورِ مہوس میں دوستو دل کی تو ہے مثال سنگ
میری متاعِ فکرِ خشت اور ہر اک خیال سنگ

روحِ اُداس جاںِ علیل وجہِ فسرِ دگی نہ پوچھ
میرے لیے تو ہم نفسِ عرصہٴ ماہ و سال سنگ

تلخ نوائی پر مری آپ سزا جو دیں تو کیا
مجھ کو تو خوب علم ہے صدق کا ہے مال سنگ

پُرسشِ غم کی اوٹ میں مشقِ ستم بھی خوب ہے
یعنی نظرِ نظر ہے تیغِ لہجہ سناں سوال سنگ

خوگرِ رنج کر کے اب مجھ پہ عنایتیں ہیں کیوں
لطف و کرم بجا مگر دستِ جفا سنبھال سنگ



اُسی کی طرح سے اُس کا بھی جی جلا میں کیا
وہ ہم کو بھول گیا ہم بھی بھول جائیں کیا

نہ اب وہ سنگِ بلا مت نہ شورشِ طفلان
یہ حال ہے تو بھلا اُس گلی میں جائیں کیا

ہیں زخمِ زخم تو نغموں میں چاشنی کیسی
جو دل بچھا ہو تو بڑا ہر سے بگم گائیں کیا

وہ بیت تھ تھا تو بیت جستجو تھی منزل کی
پچھڑ گیا بنے تو ہم بھی بھٹک نہ جائیں کیا

عجیب راہ ہے یہ راہ ترکِ الفت بھی
کہ دل یہ پوچھے ہے بہتے سے کوٹ جائیں کیا



اگرچہ محفلِ اغیار ہی میں شامل تھا
خدا گواہ کہ وہ پھر بھی جانِ محفل تھا

کسی کی یاد نے یوں تیز زور کھا مجھ کو
کہ اُس خیال میں مُضمر نشانِ منزل تھا

جراحاتوں سے ہوا یا عنایتوں نے کیا
وہ دل کا حال کہ بس دیکھنے کے قابل تھا

کرن وہ نور کی کس طرح رُوح تک آتی
کہ راہ وصل میں میرا وجود حائل تھا

جو اُن تھی چشمِ تصور تو قافلہ تھا رواں
بجھی یہ شمع تو محمل نشیں نہ محمل تھا

شعورِ حق پہ بہت گفتگو ہوئی لیکن
شعورِ ذات ہی ہر گفتگو کا حاصل تھا



رہنمائیِ حق کی راہ میں ہر لمحہ
لہجہٴ حق کی راہ میں ہر لمحہ

میں نے اپنے ہر لمحہ میں
میں نے اپنے ہر لمحہ میں

یہ کہہ کر اپنے ہر لمحہ میں
یہ کہہ کر اپنے ہر لمحہ میں

کوئی ممنون کرے مجھ کو یہ عقدہ کھولے
بارہا میں نے سنا ہے مرے آنسو بولے

میری رسوائی تماشا ہی سہی خیر مگر
اک ذرا دیر ٹہر جا یہ تماشا ہولے

میرا خوابیدہ معتبر مجھے سمجھاتا ہے
بے خبر تو بھی ذرا آنکھ جھپک لے سولے

مصلحتِ کوش کوئی مجھ میں چھپا بیٹھا ہے
اُس کے مسلک سے ذرا پیٹھے تو خیر تو لے

تجھ سے شکوہ تو نہیں تھا مگر اے دستِ شفا
ساغرِ زیست میں جب تو ہی بلا اہل گھولے

کس توقع پہ اہو دل کو کمر میں اہلِ ہنر
جب کہ تنقید کی میزان بھی جھوٹا تولے

محفلِ ماہ و شباں میں تو غزل ہونہ سکی
 بزمِ آشفقتہ سراں ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف آنکھوں میں نمی سے نہ بنے گی کوئی بات
ایک دریا سارواں ہو تو غزل ہوتی ہے

میں نے محسوس کیا ہے کہ کسی کی وہ نظر
میری جانب بگراں ہو تو غزل ہوتی ہے

دھیمے دھیمے سے سُلگتے ہوئے جذبات کے ساتھ
میر کا طرزِ بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

جس کا ہر لفظ میر کی زبان سے نکلتا ہے

میری غزلوں کی جاں ہو گئے

وہ مری داستاں ہو گئے

اُن کو اتنا پکارا کہ وہ

میری طرزِ فغاں ہو گئے

مجھ کو تلقینِ صبر و رضا

اور خود آسماں ہو گئے



میری غزلوں کی جاں ہو گئے

وہ مری داستاں ہو گئے

اُن کو اتنا پکارا کہ وہ

میری طرزِ فغاں ہو گئے

مجھ کو تلقینِ صبر و رضا

اور خود آسماں ہو گئے

خوگر رنج کر کے مجھے
ناگہاں مہرباں ہو گئے

آنسوؤں کچھ سدا کر دے
ہائے وہ بدگماں ہو گئے

کوئی تو میرے دکھ بانٹ لے
یوں تو سب ہم زباں ہو گئے

ہم سے دیوانے سوائے غم
ابروئے جہاں ہو گئے

موسم مرے دل کے

میرے گھر کے آنگن میں تو
 جانے پہچانے سب موسم
 اپنے وقت پہ آجاتے ہیں
 موسم گل میں
 سُرخ گلاب اور پیلا گیندا
 اُجلا بیلا، گوری چنبیلی
 چمپا اور گلی داؤدی
 کتنے رنگ بکھر جاتے ہیں

پھر موسم کروٹ لیتا ہے
 یخ بستہ بے مہر ہوا
 جب رقصِ زمناں کا آغاز کیا کرتی ہے
 سارا آنگن زرد شکستہ جاں پتوں سے بھر جاتا ہے

میرے دل کے آنگن میں بھی
 یہ جانے پہچانے موسم
 آتے اور جاتے رہتے ہیں
 لیکن یہ اک بات عجب ہے
 کشتِ دل میں جتنی قسموں کے بھی پھول کھلا کرتے ہیں
 سارے سُرخ ہوا کرتے ہیں
 اور پت جھڑ میں یخ بستہ بے مہر ہوا
 جب رقصِ زمناں کا آغاز کیا کرتی ہے
 شاخوں سے گرنے والے پتے بھی
 سبز ہوا کرتے ہیں

یاد رکھنے کا مہنر

یہ ایمان لالہ ایسا ہے

سنو!

یہ یاد رکھنے کا مہنر آساں نہیں ہوتا

مجھے تم یاد ہو

اور میری ہر ہر سانس میں بس کر

مشام جان معطر کر رہی ہو

ٹھیک ہے لیکن

بھلا وہ کون تھا جس نے
 تمہیں پہلے پہل چاہا
 وہ میرا عشق تھا، میں تھا!
 وہ شاید میں ہی تھا
 لیکن نہیں ہے یاد اب کچھ بھی
 سُنو!
 یہ یاد رکھنے کا ہنر آساں نہیں ہوتا
 کسی کو یاد رکھنے میں
 بہت کچھ بھول جانا بھی تو پڑتا ہے

ایک مفرد مکالمہ

تمہاری بند مٹھی میں
یہ کیسی خاک ہے جس میں
مری خوشبو ہے
میرا رنگ ہے
اور لمحہ لمحہ سوز ہوتی زندگی کی
کچھ حرارت ہے



وہی اک دھیمی دھیمی بے سخن سی گفت گو ہے
جَلتی بجھتی روشنی ہے
کچھ اُدھورے خواب ہیں
خوابوں کی تعبیریں ہیں
لیکن راکھ ہیں
اور سچ کہو تو راکھ بھی کیا ہے
یہ میری خاک بھی کیا ہے
تمہاری نیرم مُٹھی میں یہ آسودہ ہے
لیکن کب تلک آخر!
اُڑا ہی دو تو اچھا ہے

میر تقی میر

چند بے خبر

چند بے خبر

چند بے خبر

چند بے خبر

ملاقات

بعد ایک مدت کے
 اجنبی سے چہروں میں
 خواب خواب آنکھوں میں
 درد کی سماعت میں
 بے دلی کی سماعت میں
 ایک اجنبی صورت
 آشنا نظر آئی

خواب خواب آنکھوں میں
روشنی سی لہرائی
درد کی سماعت میں
نغمگی سی در آئی
بے دلی کی ساعت نے
دل کی کچھ خبر پائی

اک اُداس سناٹا اور شبِ زمستاں کی
 بے سُخن کہی ہم نے بات درِ دہیہاں کی
 چاند نے بھی چُپکے سے کچھ کہا تو تھا، ہم سے
 میرے اُجھے بالوں سے، اس کی زُلفِ برہم سے

وہ تھی، چاند تھا، میں تھا
 یوں تو کتنے چہرے تھے
 اپنی ذات کے اندر
 ہم سبھی اکیلے تھے
 سرد سرد اک چہرہ
 زرد زرد اک چہرہ
 گرد گرد اک چہرہ

درد یافتہ چہرے ہجر یافتہ چہرے
 جیسے رُوبہ رُواپنے آئینے سے رکھے تھے

سچا مال

لفظوں کے سوداگر صاحب
تم سے رسم و راہ کو کتنے جگِ بیتے ہیں
لیکن اب تم
جب آتے ہو
سچا مال نہیں لاتے ہو
اچھا مال نہیں لاتے ہو

بے بسی

نہاں خانے میں یادوں کے
نہ جانے کتنے منظر، پیش منظر اور پس منظر
طلب کی جلتی بجھتی روشنی میں جگمگاتے ہیں
اچانک ڈوب جاتے ہیں

گئے برسوں کی کتنی ساعیتوں کو موسموں کو میں
اگر آواز دیتا ہوں

تو بس اک ناشنیدہ سی صدالبیک کہتی ہے
 کوئی نادیدہ سی اک روشنی ہے جو نگاہوں میں
 فروغِ شعلہٴ خس کی طرح اُٹھتی ہے
 پھر معدوم ہوتی ہے
 مہکتے موسموں کو یاد کرتا ہوں
 تو اک نایافتہ خوشبو سی لہراتی تو ہے لیکن
 مشامِ جاں کو آسودہ نہیں کرتی
 بہت کوشش کروں تو ایک پرچھائیں سی آنکھوں میں
 اُتر آتی تو ہے لیکن
 مجسم ہو نہیں پاتی

میں اپنی بے بسی اور بے کسی پر
 صرف ماتم ہو چکا کب کا
 مگر اک آس باقی ہے
 کہ شاید پھر اچانک حادثہ ہو ورنہ کوئی

وہی اک حادثہ
جو بشرطِ آغازِ محبت ہے
وہی اک حادثہ
جس میں تقاضا ہے بچھڑنے کا

اگر ایسا ہوا تو پھر
طلب کی جلتی بجھتی روشنی میں
سارے منظر، پیش منظر اور پس منظر
اچانک جگمگا اٹھیں گے اور جلتے ہی جائیں گے
نہاں خانے میں یادوں کے
وہ چہرہ لوٹ آئے گا
صدا وہ لوٹ آئے گی
وہ خوشبو لوٹ آئے گی
بس اک لمحے کو جس کے بعد ہم
پھر سے بچھڑ جائیں، نکھر جائیں

انتظار

مری بے خواب آنکھوں میں
 مری ویران آنکھوں میں
 نہیں ہے دلکشی کوئی
 نہیں ہے دلبری کوئی
 مگر کچھ ہے
 جسے ہر صبح سورج کی کرن آ کر
 سلام شوق کہتی ہے
 ادب سے چوم لیتی ہے

بے سُنخنی

اُس نے کہا
”یہ تم نے کب سے چُپ چُپ رہنا سیکھ لیا ہے
کچھ تو کہو
تم کچھ تو بولو

دیکھو یوں چُپ چُپ رہنے سے
لفظ و صوت کے رشتے سارے
لمحہ لمحہ ٹوٹ رہے ہیں

پہلے تو
 کبھی جگمگ کرتی روشنیوں سے
 فصلِ بہاراں کی خوشبو سے
 بزمِ طرب کی نغمہ گری سے
 تم بے تاب سے ہو جاتے تھے
 دل کی بات کہا کرتے تھے

پہلے تو
 تمہیں غمگیں چہرے، کُڑھتے دل اور بہتے آنسو
 غم کے موسم، ہجر کے موسم
 درد کی ٹیسیں، کرب کی لہریں
 خون کے آنسو رواتی تھیں
 تم اشعار کہا کرتے تھے

اب کیا ہے!

اب کیوں تم گم صُصم سے رہتے ہو!

دل کی بات نہیں کہتے ہو

کچھ تو کہو

تم کچھ تو بولو“

تم کو کون بتائے — جاننا

لفظ و صوت کے وہ رشتے تو

دیر ہوئی سب ٹوٹ چکے ہیں

ہاں وہ دل کی باتیں کب تک

وہ اشعار وہ غزلیں کب تک

میرا سخن اب خاموشی ہے

میرا بچہ بے سُخنی ہے

..

تم چاہو تو یہ لہجہ یہ بے سخنی
 تم بھی اپنالو
 اور پھر اپنی خلوتِ جاں سے مجھے پُکارو
 میں یوں تم سے آن ملوں گا
 جیسے ہوا کی سرگوشی پر
 زرد ہوئے، بے قیمت پتے
 کچھ نہیں کہتے
 ٹوٹ کے اُس سے آملتے ہیں

میں بے قیمت، تم بے قیمت
پھر یہ اپنی عشق کہانی کون سُنے گا؟

سب کے اپنے اپنے قصے
سب کی اپنی اپنی باتیں
سب کی اپنی اپنی صبحیں
سب کی اپنی اپنی راتیں

سب کے غم بس ذاتی غم ہیں
 سب کی خوشیاں ذاتی خوشیاں
 ہم کہتے ہیں وہ بے قیمت
 وہ کہتے ہیں ہم بے قیمت

ایسے میں
 کس کس کی کہانی؟
 کس کی زبانی؟
 کون سُنے گا؟
 میری تمہاری عشق کہانی کون سُنے گا؟
 سب بے قیمت

یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

گاؤں کے من موہنے منظر
صبحیں، شامیں
آم کے باغوں کی وہ سیریں
جھیل کنارے کھیل تماشے
شام ڈھلے چوپال کی بیٹھک
گلیوں اور گلیاروں میں بچوں کے جھرمٹ

کھیتوں اور کھلیانوں کے سب گیت، گویے
وہ راتیں اور رات کی باتیں

صبح، پو پھٹنے سے پہلے
چڑیوں کی چہکاریں، لہرے
پن چکی کا سُندرِ نغمہ
چھکڑے اور بہلی کی سرگم
پلے لپائے کچے مکانوں کے آنگن سے
ہلکا ہلکا دھیمادھیمادل آویز دھواں اُٹھتا تھا
لیکن اب تو

وہ سارے من موہنے منظر
کب کے دل سے محو ہوئے ہیں
بس دھیمادھیماسادھواں ہے
جو پہلے کچے آنگن سے اُٹھتا تھا
اب دل سے روز اُٹھا کرتا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں

تماشا گاہِ ہستی میں بلا کی گہا گہی ہے

کہیں بادل بنائے جا رہے ہیں آسمانوں میں
 کہیں صحرا بچھائے جا رہے ہیں سبزہ زاروں پر
 کہیں تنکے سجائے جا رہے ہیں آشیانوں کے
 کہیں بجلی گرائی جا رہی ہے آشیانوں پر
 کہیں پھر صبح کے ماتھے پر اک سورج سجایا ہے
 اُنق کے نیلگوں پانی میں پھر اُس کو بچھایا ہے
 اندھیرا لوٹ آیا ہے

کہیں پھر چاند کو چمکا دیا ہے بام پر لا کر
 کبھی گہنا دیا ہے دفعتاً انجم پر لا کر
 کہیں پر پھوٹتی کونسل سے آغازِ بہاراں ہے
 کہیں پر زرد موسمِ پھر سے چھا جانے کا امکان ہے
 کہیں پر بام و در سجتے ہیں نغمے گائے جاتے ہیں
 کہیں دل پر عجب انجانے غم لہرائے جاتے ہیں

تماشا گاہِ ہستی میں عجب اک کھیل جاری ہے
 ستارے چاند، سورج، آسمان اور بحروں سارے
 ہوائیں اور خوشبو، نغمہ و آہنگ گرسارے
 اسی اک کھیل میں تاحذامکاں صرف ہوتے ہیں
 تماشا گاہِ ہستی میں بلا کی گہا گہمی ہے
 تو پھر اس میں تعجب کیا
 اگر میں بھی اسی تمثیلِ ہستی میں
 کہیں پر خسر چ ہو جاؤں

ہمیشہ قتل ہو جاتا ہوں میں

بساطِ زندگی تو ہر گھڑی بچتی ہے اُٹھتی ہے
یہاں پر جتنے خانے جتنے گھر ہیں
سارے

خوشیاں اور غم انعام کرتے ہیں
یہاں پر سارے مہرے
اپنی اپنی چال چلتے ہیں

کبھی محصور ہوتے ہیں کبھی آگے نکلتے ہیں
یہاں پر شہ بھی پڑتی ہے
یہاں پر مات ہوتی ہے
کبھی اک چال ٹپکتی ہے
کبھی بازی پلٹتی ہے

یہاں پر سارے مہرے اپنی اپنی چال چلتے ہیں
مگر میں وہ پیادہ ہوں
جو ہر گھر میں

کبھی اس شہ سے پہلے اور کبھی اس مات سے پہلے
کبھی اک بُرد سے پہلے کبھی آفات سے پہلے
ہمیشہ قتل ہو جاتا ہے

گھر کے کمپیوٹر پینل پر
اک چالان وصول ہوا ہے
میرے نئے رولوٹ نے لا کر مجھے دیا ہے
جس میں لکھا ہے
جرمانہ دو جرمانہ دو..
جلد ادا ہو ورنہ سزا ہو

میں چالان کی جانی پہچانی تحریر کو دیکھ رہا ہوں
 جو کہتی ہے
 کل دن ڈھلنے سے کچھ پہلے
 تم نے اپنے حق سے بڑھ کر
 دو گہری سانسیں لے لیں تھیں
 ہرمانہ دو

سفاری پارک

جنگل دریا، اُونچے نیچے ٹیلے اور میدانوں میں
 بل کھاتی اک سڑک گئی ہے
 اس جنگل میں آنے والے
 اپنی اپنی موٹر میں شیشوں کو چڑھائے
 دُور بین آنکھوں سے لگائے
 ہرن، چکارے، پھیتے، باگھ اور ہاتھی، گینڈے

۱۹۸۵ء جشنِ سفار۱۹۸۵ء جشنِ سفار۱۹۸۵ء جشنِ سفار۱۹۸۵ء جشنِ سفار۱۹۸۵ء جشنِ سفار

شیر زرافے، بندرگائے
خاموشی سے دیکھ رہے ہیں
لیکن اُن کو شاید یہ معلوم نہیں ہے
ہرن، چکارے، چھتے، باگھ اور ماتھی گینڈے کے بچے بھی
ضد کرتے ہیں
”چلو سٹرک پر چلو سٹرک پر
ہم بھی
روز گزرنے والے، اُجلے اُجلے کالے کالے
جانوروں کو دیکھیں گے“

میں نے اپنے گھر کے باہر
یہ اعلان لگا رکھا ہے
”میں اک سیلانی شاعر ہوں
پورب پیچھم اُتر دکن
نگر نگر اور بستی بستی
رکتا چلتا، چلتا رکتا
گھوم رہا ہوں

لیکن مجھ کو ڈھونڈنے والو
 میں تو تمہیں ہر لمحہ ہر دم
 اپنے گھر میں
 جیتے جاگتے ہنستے بولتے، لڑتے مرتے، پڑھتے لکھتے
 بچوں ہی میں مل سکتا ہوں“

جس میں محبت جاگ اُٹھی تھی

Scanned by CamScanner

انسان

دیکھو میں کتنا اچھا ہوں
 دیکھو میں کتنا سچا ہوں
 میرے ظاہر اور باطن میں فرق نہیں ہے
 ہے بھی اگر تو بس اتنا ہے
 باطن میں ظاہر سے بڑھ کر
 سفاکی کا زہر بھرا ہے

بے آس

پُھول مرے گلُداں کے مُرجھاتے رہتے ہیں
لیکن اب کے یوں لگتا ہے
جیسے وہ آجانے والا
لوٹ کے شاید کبھی نہ آئے

بے ساختہ

میری نظموں اور گیتوں میں
لفظوں کی ہیرا پھیری کے جوہر جب کھلنے لگتے ہیں
تب شاید
اک سچا حرف بھی لکھ جاتا ہوں

آرزو کی انتہا

ٹہرے ہوئے پانی میں
 یوں دُور بیٹھ کر
 کنکر نہ پھینکو
 اس بلچل سے کیا حاصل
 قریب آؤ اور آخری بار
 آئینہ آب پر
 اپنے حسیں خدو خال ثبت کر دو
 سوکھتے تالاب کو اس سے زیادہ کی آرزو بھی نہیں

دُعَا

تم مجھے بہت عزیز ہو
 سوچتا ہوں کہ خدا سے تمہارے لیے کیا مانگوں
 دولت و شہرت
 علم و اقبال مندی
 خوش وقتی و کامرانی
 شاد کامی محبت یا ناشادی عشق

مُسکونِ جاں یا بیتابی رُوح
کون سی دُعا مانگوں !

اچھا سُنو !
میں تمہارے لیے سب سے اچھی دُعا مانگتا ہوں
کیا عجب کہ میرا خدا تمہیں بھی
قلبِ مطمئن عطا کر دے

سچ یہی ہے کہ

نہ تو میرا عشق آفاقی ہے

اور نہ ہی میری زندگی

میرا خمیر اسی خاک سے اُٹھا ہے

توپر

میں کیوں نہ اپنے ہی زمان و مکاں کے حصار میں رہوں

اور میرا عشق یوں نمودیا

کہ اُس کے پاؤں تلے زمین مٹھی ہو

اور سر پہ آسمان بھی

تشویش

رات گئے
میں اپنی نڈھال رُوح اور تھکے ہوئے جسم کے ساتھ
بستر پر ڈھیر ہو کر سوچتا ہوں
کہ کل پھر
استقبالی کاؤنٹر پر
ایک لاکھ مرتبہ کیسے مُسکرا سکوں گا

شمارِ معکوس

شہرتِ طلبی کی گنتی
بے تکان گنتے چلے جانے والے

بے خبر ہیں
اُس ساعتِ سفاک سے

جب
اُلٹی گنتی کے جبر میں
سانس اکھڑ جاتی ہے

خواہش

اِس سے پہلے کہ میرا وجود
 ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکھر جائے
 اک آخری بار
 اُسے تخلیق کرنا چاہتا ہوں، تراشنا چاہتا ہوں
 لیکن اِس طرح
 کہ اُس کے سینے میں میرا دل
 اور اُس کے چہرے پر میری آنکھیں ہوں

ہمار جیت

میرے دشمن کی سفاک مہارت
 جب بُرشِ تیغ سے چراغِ گلورِ روشن کرتی ہے
 تو ہر سُوسُرخِ روشنی بکھر جاتی ہے
 اور یوں میرا دشمن بھی سُرخ رُو نظر آتا ہے
 لیکن کچھ بھی ہو
 وہ مجھ سے جیت نہیں سکتا
 اس لئے کہ یہ چراغ بھی میرا ہے
 اور یہ روشنی بھی

دولت، شہرت، خوش وقتی اور کامرانی
سب پنسل کی تحریریں ہیں
جنہیں وقت کا رُبڑ
بے دردی سے مٹائے ڈالتا ہے
روشن وقائم تو ایک ہی لفظ لکھا جاسکا ہے
محبت

ایک عظیم فنکار ہے

احساس اُس وقت ہوا

دورانِ رقص

ل. د. محمد صالح المنجد

کے پاؤں تلے کچلا گیا

جواز

نہ تو مجھے دھوئیں کے مرغولے مرغوب ہیں
اور نہ ہی تمباکو کی تلخی محبوب
سگریٹ میری بے بسی کا کفارہ ہے
میں بصدا اختیار و بہ ہزار بیگانگی
ایک بھر پور کش کے بعد
راکھ کو بڑی نخوت سے جھاڑ دیتا ہوں
کہ یہ مجھ سے بھی بڑھ کر
بے توقیر ہے

تسلسل

میری آتشِ فکر اور شعلہ نوائی
بے حس سماعتوں سے مکالمہ کرتے کرتے
تھک گئی تو پھر
راکھ کے لہجے میں گفتگو کرنے لگی

احساسِ ندامت

گناہوں اور مایوسیوں کے بے پناہ اندھیرے میں
ناگہاں اُجالے کی ایک تحریر
میرے احساسِ ندامت سے پھوٹ نکلی

اُس کی خاطر

جب وہ مجھ سے ملا
اُس وقت تک تو میں راکھ ہو چلا تھا
مگر پھر بھی
تا دیر سگلتا رہا
اُس کی خاطر

پسپائی

میں بزدلوں کے لشکر کا بہادر ترین فرد ہوں
مگر نہ جانے کیوں
اُن میں رہ کر
اپنے ضمیر کی جنگ ہارتا جا رہا ہوں

خیر مقدم

شتیلا کی تباہ حال بستی میں

چھوٹے بڑے مکانوں کی

کھلی کھڑکیاں

تازہ ہوا اور موت کا

ہمیشہ خیر مقدم کرتی ہیں

میری خاطر

ایک طویل نوری سال کے فاصلے پر

کسی نے

ایک دیا روشن کیا ہے

میری خاطر

خیال تھا
کہ آواز کا نور پیکر نہیں تراش سکتا
اور روشنی کی پکار کا
سناٹے جواب نہیں دیتے
مگر یوں بھی ہے کہ
حی علی الصلوٰۃ کی صدا مجھے ہر صبح تخلیق کرتی ہے
اور صبحِ سعادت کی روشنی پر
میرے دل کا سناٹا بیک پکار اٹھتا ہے

استغاثہ

بجھور سرور کو نین صلی اللہ علیہ وسلم

حضور پھر دل مضطر ہوا ہے اذن طلب زمانہ ہو گیا احوالِ غم سُنائے ہوئے
 حضور آج کا نساں ہے پھر نفاق زدہ چراغِ مہر و محبت میں سب بجھائے ہوئے
 حضور پھر سرِ افلاک بے ستارہ ہے فضا ئے دہریہ بادل ہیں غم کے چھائے ہوئے
 تمام لشکرِ اعدا میں اپنے چہرے ہیں یہ ہم ہیں اپنے ہی ہاتھوں سے زخم کھائے ہوئے
 حضور آپ ہی کیجئے قلوب کی تالیف کہ ہم ہیں آج ہر میت کے غم اٹھائے ہوئے
 حضور دور کش کش میں ہم بھی جیتے ہیں بس ایک آپ کی رحمت سے لو لگائے ہوئے

یہ دور توند ہواؤں کا دور ہے اس میں

چراغ جلتے ہیں بس آپ کے جلائے ہوئے

